ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

کی خدمت میں

جنوبی ہند میں دو ہفتے

آزاد

۲۰ اکتوبر ۱۹۵۱

جنوبی ہند میں دو ہفتے

جگن ناتھ آزاد

دہلی کتاب گھر، دہلی

طبع اوّل

ایک ہزار

قیمت

ایک روپیہ

پرنٹر گلاب چند کپور اینڈ سنز دہلی

پبلشر دہلی کتاب گھر دہلی

اردو ایسوسی ایشن

گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس

کے نام

جس کی دعوت پر مجھے جنوبی ہند میں

سیر و سیاحت کرنے اور اردو کی

رفتار و ترقی کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

اقبال

۹

جنوبی ہند میں دو ہفتے

گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس کی اُردو ایسوسی ایشن کے وائس پریزیڈنٹ سیّد حامد اشرف کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہُوا کہ ہم لوگ کالج میں ایک مشاعرہ منعقد کر رہے ہیں۔ آپ بھی اس میں شرکت کیجیے۔ دعوت نامے کو دیکھ کر تعجب ہوا —— مدراس اور مشاعرہ —— آخر ان دونوں میں کیا تعلق ہے۔ مدراس کے متعلق اتنا تو میں جانتا تھا کہ یہ کسی زمانے میں جنوبی ہند کے لئے اُردو کے مرکز کا کام دے چکا ہے۔ اور اب بھی ڈاکٹر عبدالحق پرنسپل پریذیڈنسی کالج کی بدولت وہاں اُردو کا نام زندہ ہے۔ لیکن یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ مدراس میں ایسا مشاعرہ بھی ہو سکتا ہے جس میں شرکت

کے لئے دلی سے کسی کو دعوت دی جائے۔

اسی کشمکش کے عالم میں میں نے اپنے آپ کو مشاعرہ میں شرکت کے لئے آمادہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ہر بار اس خیال کے تحت دعوت قبول کرنے کا ارادہ ترک کر دیا کہ مدراس میں اردو کا کلام کون سُنے گا اس دوران میں اشرف صاحب کے ساتھ خط وکتابت بھی ہوتی رہی۔ آخر انھوں نے ایک خط میں لکھا:۔

"مشاعرے کے انتظامات بہ فضلِ خدا جاری ہیں۔ انشاءاللہ یہ مشاعرہ نہایت کامیاب ہوگا۔ اور آپ جنوبی ہند سے ایک یاد لے کر واپس ہوں گے۔"

اب اس خط کے بعد شریک نہ ہونے کا فیصلہ کرنا ایک غلطی تھی چنانچہ میں نے اپنے آنے کی اطلاع ان کو دے دی۔ اور ساتھ ہی اپنے دیرینہ کرم فرما ڈاکٹر محی الدین قادری زور کو بھی خط لکھ دیا کہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے مدراس جا رہا ہوں۔ آپ سے ملاقات کی تمنا ایک مدت سے ہے اگر آپ ان ایام میں حیدرآباد میں ہوں تو میں راستے میں ایک آدھ دن کے لئے اتر جاؤں۔ تاکہ آپ سے اور سروری[1] صاحب سے ملاقات ہو سکے۔

[1] پروفیسر عبدالقادر سروری

ڈاکٹر زور نے کچھ اس محبت بھرے انداز سے میری اس تجویز کا خیر مقدم کیا کہ میرا حیدر آباد جانے کا ارادہ پختہ تر ہو گیا۔ اور میں ۲۹ اکتوبر کو دلی سے روانہ ہو گیا۔

گاڑی شام کے سات بجے چلی۔ میں دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ نو بجے کے قریب سو گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو ریل بھوپال کے ہرے بھرے میدانوں میں سے گزر رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں بھوپال کا اسٹیشن آ گیا۔ یہاں ایک صاحب ہمارے ڈبے میں داخل ہوئے۔ اور میرے قریب آکر بیٹھ گئے۔ ریل چلی تو انھوں نے اپنا بیگ کھولا۔ اور اس میں سے پانچ سات رسائل اور کتابیں نکالیں۔ دو ایک رسائل انگریزی کے تھے۔ دو کتابیں ہندی کی اور ایک اردو کی۔ یہ صاحب شکل و صورت اور لباس سے مراٹھی نظر آتے تھے میں چاہتا تھا کہ ان سے بات کروں۔ لیکن وہ محو مطالعہ تھے اور ان کے مطالعہ میں مخل ہونا میں نے مناسب نہ سمجھا۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے اپنے بیگ سے کچھ پھل نکالے۔ اور مجھے بھی شریک ہونے کو کہا۔ میں تو خود ان سے بات کرنے کا متمنّی تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان کے مراٹھی ہونے کے متعلق میرا خیال صحیح ہے

انھوں نے اپنا نام وی نارائن راؤ بتایا۔ وی نارائن راؤ انگریزی، گجراتی، ہندی اور اردو یہ چاروں زبانیں جانتے تھے۔ اردو کے متعلق کہنے لگے کہ میری واقفیت بہت کم ہے۔ اس زبان سے میری دل چسپی منشی پریم چند کے افسانوں سے شروع ہوئی۔ اور اب بھی ادب کی تمام اصناف میں میں افسانوں ہی کو پسند کرتا ہوں۔ اردو میں مجھے کرشن چندر اور احمد عباس کے افسانے بہت پسند ہیں۔ کبھی کبھی نظم کا مطالعہ بھی کر لیا کرتا ہوں۔ لیکن زیادہ لگاؤ مجھے گجراتی اور انگریزی سے ہے۔ اردو کے متعلق میں نے پوچھا کہ ان دنوں آپ کے زیر مطالعہ کون سی کتاب ہے تو انھوں نے ساتھ رکھی ہوئی کتاب مجھے اٹھا دی۔ یہ راما نند ساگر کا ناول تھا۔ "اور انسان مر گیا" اس کے بعد بیگ سے ایک اور اردو کی کتاب نکالی اور کہا یہ ایک دوست نے مجھے پڑھنے کو دی ہے۔ لیکن مجھے اتنی اردو نہیں آتی کہ نظم کو اچھی طرح سے سمجھ سکوں۔ یہ کتاب اردو کے قریب ایک گم نام شاعر راج بلد یو کا مجموعۂ کلام تھا "ناقوس"۔ میں اس کتاب اور اس کے مصنف کو اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن نارائن راؤ سے اس موضوع پر بات نہ ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ اردو شاعری کا مطالعہ ان کا بہت کم تھا۔ میں

یہ کتاب ایک بار پہلے پڑھ چکا تھا۔ اس کتاب کے مصنف کا شمار اردو کے اُن شعرا میں ہے جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

۱۹۴۳ء کے لگ بھگ راج بلدیو راج کا نام لاہور کے ادبی حلقوں میں جس تیزی سے چمکا تھا اسی تیزی سے دو ایک برس بعد دنیائے ادب سے محو ہو گیا۔ میں نے اس کتاب کے ورق الٹے اور اس کے اکثر حصوں میں مجھے وہی تازگی اور حرارت نظر آئی جو آج سے پانچ سات برس پہلے اس شاعر کے کلام میں محسوس ہوتی تھی۔ میں اس راز کو اب تک نہیں سمجھ سکا کہ بعض بہت اچھا کہنے والے شاعر اچانک اس طرح خاموش کیوں ہو جاتے ہیں کہ پھر اُن کا کوئی مصرع یا کوئی شعر سننے میں نہیں آتا۔ یہ مجموعۂ کلام کوئی ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس میں بہت حسین و جمیل اشعار موجود ہیں۔ یہاں راج بلدیو کی شاعری پر مجھے کوئی ادبی بحث چھیڑنا یا تبصرہ کرنا مقصود نہیں صرف تفنّنِ طبع کے لیے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

ڈھلتا نہیں زبان کے سانچے میں ہر خیال
نغمے تڑپ رہے ہیں مری بانسری سے دور

مجھے بے نیازِ الم نہ کر مجھے بے نصیبِ ستم نہ کر　　　مرے غم کی لذتِ جاوداں مری زندگی کی بہار ہے

بے سرخی و بے رنگ ہے افسانۂ ہستی　　　جب تک کہ لہوِ دل کا نہ اشکوں میں ہو شامل

پھولوں کے ناز اہلِ چمن کو رہیں نصیب　　　خنداں ہیں خارہائے بیاباں مرے لئے

میں جی رہا ہوں تیرا سہارا لئے بغیر　　　اک زہر پی رہا ہوں گوارا کئے بغیر
کیا زندگی ہے اہلِ گلستاں کی زندگی　　　گل ہنس رہے ہیں چاکِ گریباں سیئے بغیر
برقِ چمن حدودِ چمن سے نکل کے دیکھ　　　تاریک ایک اور بھی گھر ہے دیئے بغیر
اے راز آج راس آ نہ سکی محفلِ حیات　　　ہم آ گئے تھے کس کی اجازت لئے بغیر

آج جو ایثار کا جذبہ ہے پروانوں کے پاس
تھی کبھی یہ دولتِ بیدار انسانوں کے پاس
عقل ہے اک آستیں کا سانپ فرزانوں کے پاس
بے خودی کتنی بڑی دولت ہے دیوانوں کے پاس

سفینے کھے رہا ہوں میں تلاطم خیز طوفاں میں　　لئے جاتا ہے مجھ کو شوق میرا ناخدا ہو کر

نارائن راؤ سے میں نے پوچھا آپ اُردو کے اچھے شعرا کے نام سے تو واقف ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ غالب اقبال اور جوش کا نام میں نے بہت سنا ہے۔ اور میری بڑی آرزو ہے کہ میں ان شاعروں کے کلام کا مطالعہ کروں۔ لیکن جب تک ان کے انگریزی یا گجراتی ترجمے مجھے دست یاب نہ ہوسکیں میں ان کے کلام سے مستفید نہیں ہوسکتا۔ میں نے انھیں بتایا کہ اقبال کی دو فارسی مثنویوں۔ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کا تو انگریزی ترجمہ موجود ہے۔ لیکن غالب اور جوش کے ترجمے میری نظر سے نہیں گزرے غالب کا ایک ترجمہ اُردو اکیڈیمی لاہور کا چھپا ہوا مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا لیکن وہ ترجمہ ہر اعتبار سے ناقص تھا۔ اس لئے میں نے اس کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

نارائن راؤ بہت وسیع المطالعہ شخص تھے۔ انھوں نے ادب کے مختلف اصناف پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سیر و سیاحت بھی انھوں نے بہت کی تھی۔ کشمیر اور نیپال کا انھوں نے خاص طور پر ذکر کیا۔ کشمیر کے متعلق نو نہر

روزانہ اخبارات میں پڑھنے کے باعث بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا اور چند دن کے لئے مجھے کشمیر جانے کا اتفاق بھی ہو چکا تھا۔ لیکن نیپال کے متعلق میری واقفیت بہت کم تھی۔ اور چین کی سیاسی صورت حال کے پیش نظر نیپال کے متعلق کچھ جاننا ضروری بھی تھا۔ لہٰذا میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں چین کی سیاسیات کا نیپال پر کیا اثر پڑے گا۔ وہ کہنے لگے کہ اس دور میں کسی ملک کی سیاسی صورت حال کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس کی اقتصادیات کا جائزہ لینا چاہیئے کیوں کہ اس زمانے میں سیاسیات کی باگ ڈور اقتصادیات کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ نیپال کی اقتصادی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اقتصادی طور پر نیپال کے لوگ بہت پس ماندہ ہیں۔ ان کا خاص پیشہ زراعت ہے۔ پہاڑ کی ڈھلان پر جو مکی اور باجرے کی کاشت ہوتی ہے۔ دریاؤں کی وادیوں میں چاول پیدا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں یہ امر نہایت ہی افسوس ناک ہے کہ حکومت کی بے توجہی کے باعث زمین کا ایک کافی حصہ جو اچھے خاصے مصرف میں لایا جا سکتا ہے بے کار پڑا ہے۔ نہریں اس دیس میں بالکل مفقود ہیں اور کھٹمنڈو کی وادی میں کھیتی باڑی ہل کے عوض بیلچوں اور کدالوں

سے ہوتی ہے۔

نیپال کے نظامِ حکومت میں جاگیرداری کہیں دکھائی نہیں دیتی لیکن اس سے بھی بدتر چیز جسے "بِترا" کہتے ہیں موجود ہے۔ زمین کے مالک کو زمین پر ہر قسم کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ حکومت اکثر اوقات زمین کے مالیئے سے بھی محروم رہتی ہے۔ مزارعین کو مالک کے خلاف حکومت کے سامنے اپیل کرنے کا کوئی اختیار نہیں اور وہ ہر طرح مالک کے رحم پر ہوتے ہیں۔ اس نظام کا تاریک ترین پہلو یہ ہے کہ زمینوں کے مالک اکثر شاہی خاندان کے افراد ہوتے ہیں۔

نیپال کی اقتصادی زندگی کا ایک مضر پہلو یہ ہے کہ یہاں زرعی جمود کے باعث بے روزگاری روز بروز بڑھ رہی ہے۔ یہ لوگ روزگار کی تلاش میں اکثر اپنا گھر بار چھوڑ کر ہندوستان آجاتے ہیں۔ چونکہ حکومت نے ابھی اس طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے لہذا یہ لعنت بڑی سرعت سے پھیل رہی ہے۔ اگر ملک میں صنعت و حرفت کی جانب توجہ کی جائے تو لوگوں کی ایک خاصی تعداد کو روزگار مہیا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حکومت اس وقت قدامت پرستی کی زنجیروں میں کچھ اس طرح گرفتار ہے کہ صنعتی قسم ...

پر عمل پیرا ہونے کا خیال ہی اُسے نہیں آتا۔ اور زیادہ بُری بات یہ ہے کہ ترائی کے علاقے میں جو ایک آدھ کارخانہ موجود ہے اس سے بھی خود نیپال نہیں بلکہ باہر کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ شاہی خاندان کے افراد اگرچہ بہت دولت مند ہیں لیکن وہ بھی اپنا سرمایہ ملک کی صنعتی ترقی کے لیے استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنا سرمایہ غیر ملکی صنعتوں میں لگاتے ہیں۔ اور قوم کی ترقی سے بالکل آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں۔

بیرت نگر میں پٹ سن کے کچھ کارخانے موجود ہیں۔ جن میں سرمایہ اور محنت ہندوستانیوں کی ہے۔ یہ کارخانے خاصے منافع پر چل رہے ہیں۔ ان کے علاوہ سگرٹ اور دیا سلائی کے بھی دو کارخانے ہیں۔ کٹھمنڈو اور اس کے گرد و نواح میں آٹا پیسنے کی مشینیں اور تیل نکالنے کے کارخانے بھی موجود ہیں کٹھمنڈو میں سڑکیں پختہ ہیں اور یہاں اکثر کاریں اور لاریاں چلتی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ابھی تک حکومت نے کٹھمنڈو کو ریل یا موٹر کے ذریعہ سے بھیم پھیدی کے ساتھ جو نیپال کی سرحد پر آخری چوکی ہے اور ہندوستان کے ساتھ ٹرانسپورٹ کے ذریعے سے ملی ہوئی ہے ملانے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔ فقط یہ ہی نہیں تک ایک ہلکی سی ایک ریل ہے جو

رکسول سے امریکہ گنج کے درمیان چلتی ہے۔ یہ ریل ۱۹۲۷ء میں بنائی گئی تھی۔

یہاں کے عوام کا افلاس ناقابل بیان ہے۔ اسّی فی صدی لوگوں کو تو پیٹ بھر کر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ تعلیم کا معیار بھی بہت پست اور ناقص ہے۔ سارے نیپال میں کوئی اخبار نہیں اور نہ کوئی پبلک لائبریری ہی پائی جاتی ہے۔ ملک بھر میں چار ہائی اسکول ہیں۔ دو مڈل اسکول ہیں اور ایک کالج ہے جس میں سائنس کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے ایشیائی ممالک میں تجارتی اعتبار سے نیپال کی صنعت ختم ہو گئی تھی۔ نیپال چاول، عمارتی لکڑی، نارنگیاں، گھی اور پٹ سن باہر بھیجتا ہے اور مشینری، کپڑے، دیگر ضروریاتِ زندگی، خوشبوئیں اور عیش و عشرت کا سامان باہر سے منگواتا ہے۔

مؤرخین کا کہنا ہے کہ آج سے سو سال پہلے نیپال کی اقتصادی حالت اتنی خستہ نہیں تھی جتنی اب ہے۔ انگریز سیّاحوں کا بیان ہے کہ کچھ مدت پہلے نیپال کھڈیوں کا گھر تھا اور گھر گھر میں کھڈیاں لگی ہوئی تھیں

اپنی ضروریات کے مطابق نیپال اپنے لئے کپڑا خود تیار کرتا تھا۔ کپاس بھی اتنی ہوتی تھی کہ کھڈیاں سارا سال چلتی رہتی تھیں۔ اور نیپال میں تیار کئے ہوئے کپڑے تبت اور ہمالیہ کے دیگر علاقوں میں فروخت ہوتے تھے۔

بدقسمتی سے آج یہ صورت حال نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں کہ کپاس کے ہرے بھرے کھیت نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ بلکہ کھڈیوں کی صنعت کا زمانہ بھی ایک بھولی بسری کہانی بن کر رہ گیا ہے اب اگرچہ بعض حلقوں میں اس کو دوبارہ جاری کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن برطانوی کپڑے کی درآمد کے مقابلے میں اس صنعت کا دوبارہ جاری ہونا قریب قریب ناممکن نظر آتا ہے۔

ہندوستان کی کرنسی سے ملتا جلتا نیپال کا اپنا کرنسی کا انتظام ہے لیکن یہ انتظام اب اتنا بوسیدہ ہو چکا ہے کہ اس میں خاطر خواہ تبدیلی کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ ایک بار تو ایسا بھی ہوا تھا کہ ہندوستانی کرنسی کے مقابلے میں نیپال کی کرنسی کی قیمت گر گئی تھی لیکن دوسری جنگ کے دوران میں صورت حال سنبھل گئی۔ اب نیپالی روپیہ اپنی پرانی

قیمت پر واپس آگیا ہے۔ ملک میں سونا چاندی تقریباً نایاب ہے۔

اس وقت نیپال کا تقریباً تین کروڑ روپیہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے بینکوں میں پڑا ہے۔ تجارت میں جو خسارہ ہوتا ہے اس کی کمی یوں پوری کی جاتی ہے کہ ترائی کے علاقے کی سرکاری آمدنی کا دو تہائی کلکتہ کے بینکوں میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

نیپال بیرونی دنیا سے بالکل الگ تھلگ اور ہر اعتبار سے کٹا ہوا ہے حتیٰ کہ نیپال اور ہندوستان کے درمیان تار کا انتظام بھی نہیں۔ بیرگنج کے سرحدی شہر اور کھٹمنڈو کے درمیان ٹیلیفون کی لائن موجود ہے۔ باقی تمام شہر اور علاقے ذرائع رسل و رسائل سے محروم ہیں۔ ڈاکخانہ ہے لیکن اس کا انتظام بہت ناقص ہے۔ آمد و رفت کے لئے مشرق سے مغرب تک ایک سڑک بنائی ہے۔ جو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پیغام رسانی کا واحد ذریعہ ہے۔

نیپال دنیا کا واحد ملک ہے جہاں کوئی خبر رساں ایجنسی نہیں۔ چنانچہ بیرونی دنیا کے لئے یہ ملک ایک بند لفافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

گاڑی کی رفتار اب مدھم ہو چلی تھی۔ اگلا اسٹیشن اٹارسی کا تھا

نارائن راؤ کو یہیں اُترنا تھا۔ انھوں نے نیپال کے متعلق اپنی بات چیت یہیں ختم کی۔ سامان سمیٹا اور گاڑی رُکی تو مسکراتے ہوئے "آداب عرض" کہا اور اُتر گئے۔

اُن کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک ہندوستان میں اُردو کے مستقبل کے بارے میں سوچتا رہا۔ مراٹھیوں کے متعلق میرا خیال تھا کہ یہ لوگ اُردو نہیں جانتے ہوں گے لیکن نارائن راؤ کی ملاقات نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ نارائن راؤ نے ساری بات چیت اُردو میں کی تھی۔ اور اپنا مافی الضمیر پوری طرح سے مجھ پر واضح کر دیا تھا۔ اصل میں اُن کی گفتگو اتنی دلچسپ تھی کہ میں اُن سے یہ پوچھ ہی نہ سکا کہ مہاراشٹر میں اُردو زبان کی کیا کیفیت ہے اور وہاں ہندوستان کی اس زبان کا کیا مستقبل ہے۔

اُردو کے عروج اور زوال کی ساری تصویر اس وقت میری نگاہوں میں پھر رہی تھی۔ ہندوستان میں امیر خسرو کی شاعری۔ دورِ جہانی میں اُردو کی ابتدا۔ انگریزوں کی آمد۔ زبان کی تعمیر میں فورٹ ولیم کا حصہ۔ یوپی کے انگریز گورنر کی بدولت صوبے میں اُردو اور ہندی کے جھگڑے کی ابتدا۔

اردو کی تعمیر میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم ہندو فن کاروں کا حصہ۔ آزادی کی جدوجہد میں اردو کی خدمات۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے جھگڑے میں اردو کی پوزیشن۔ قائداعظم محمد علی جناح کے چودہ نکات میں اردو کی موجودگی۔ ملک کی تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں اردو کی کیفیت اور پھر ہندوستان میں ایشیا کی اتنی بڑی پروگریسو زبان کا یہ انجام کہ ع

بھٹکتی پھر رہی ہے یوسف بے کارواں ہوکر

میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا کہ اس ملک میں اس زبان کا انجام کیا ہوگا۔ امید اور مایوسی دونوں دل میں رقص فرما تھیں۔ کبھی میرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ جناح صاحب نے اردو کو مسلم لیگ کے چودہ نکات میں شامل کرکے ایک بڑی غلطی کی تھی۔ کیوں کہ اس بات نے مخالف طبقے کے دل میں یہ خیال بٹھا دیا تھا کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی زبان مذہبی حیثیت سے اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ عربی ہے کیوں کہ یہی قرآن کی زبان ہے اور اسی میں مسلمانوں کے ہادیؐ نے نوعِ انسان کو اپنا پیغام دیا۔

پھر یہ خیال آتا تھا کہ جناح صاحب نے تو علم و ادب کے نقطۂ نگاہ

سے یہ غلطی کی ہی تھی ہندوستان کے اُس آزادی پسند طبقے کے دل و دماغ کو کیا ہو گیا ہے جو اپنے آپ کو اس ملک کے عظیم تہذیب و تمدن کا وارث سمجھتا ہے۔ کیا اُردو زبان اور اُردو ادب ہندوستان کے تہذیب و تمدن کا جزو نہیں ہے۔ کیا یہ پھول اسی گلستاں کی خاک سے اور اسی کی آب و ہوا میں پیدا نہیں ہوا؟ کیا یہ ہندوستان کی مشترکہ قومیت کا ایک زندہ ثبوت نہیں ہے؟ کیا اس پودے کو ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر اپنے خونِ جگر سے نہیں سینچا؟ کیا اُردو کے ختم ہونے سے ہندوستان کی تمدّنی خوبصورتی میں نمایاں کمی واقع نہیں ہو جائے گی؟ کیا یہ اس وقت بھی ہندوستان کے متعدّد صوبوں کی عام بول چال کی زبان نہیں ہے؟ اگر پاکستان نے اُردو کو اپنی سرکاری زبان تسلیم کر لیا ہے تو کیا ہم پر یہ فرض عائد آتا ہے کہ ہم اس زبان کی مخالفت کریں؟ جس ملک کی یہ زبان ہے کیا اس پر اس کی بقا اور ارتقاء کے لئے کوئی فرض لازم نہیں آتا؟ جب اُردو پاکستان کے کسی صوبے کی بول چال کی زبان نہیں تو اس کی حفاظت و اس کی ترقی کا فرض کس ملک پر عائد ہوتا ہے؟

اس سوچ میں ریل میلوں آگے نکل گئی۔ کچھ وقت میں نے پڑھنے

میں گزرا۔ کچھ مناظر دیکھنے میں۔ شام کے سات بجے گاڑی واردھا پہنچی۔ وہی واردھا جو مدتوں ہندوستان کی جنگِ آزادی کے قافلہ سالار کا مسکن رہا ہے۔ وہی واردھا جہاں ہندوستان کے بہترین دل و دماغ متعدد مرتبہ چالیس کروڑ ہندوستانیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہوئے وہی واردھا جہاں مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے مل کر ہندوستان کے نئے نظامِ تعلیم کی بنیاد رکھی جسے آج واردھا کی تعلیمی اسکیم کہا جاتا ہے۔ آج یہ واردھا ایک نجدِ بے قیس ـــــ یا ایک محملِ بے لیلیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مہاتما گاندھی کا خیال آتے ہی جوش ملیح آبادی کی اس نظم کے یہ اشعار ذہن میں آ گئے جو اس عظیم فن کار نے اس عظیم رہنما کی وفات پر کہی تھی ۔

اے امیرِ کاروانِ پختہ کارانِ وطن اے گلِ اے تاج دارِ تاج دارانِ وطن
اے امیدِ ہمتِ ناکامگارانِ وطن اے ہلاکِ شیوۂ خوں ریز یارانِ وطن

اے شکارِ کج روان و کور مغزاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

تو امینِ مرحمت آئینۂ ایثار تھا صحتِ افکارِ انساں کے لئے بیمار تھا

برہمن کا چارہ فرما شیخ کا غم خوار تھا — نورِ رواداری کا دیوتا امن کا اوتار تھا

السلام اے کعبہ و کاشی کے درباں السلام

السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

جادۂ حق پر درخشاں ہیں ترے نقشِ قدم — پرفشاں ہے آسمانِ عدل پر تیرا علَم

اے حسین ابنِ علی کے پیروِ قدسی حشم — اے یزیدِ عصرِ نو کے کشتۂ مشقِ ستم

اے صلیبِ تازہ کے عیسیٰ دوراں السلام

السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

اے گلِ افسردۂ بستانِ حق و راستی — اے سرودِ رفتۂ بزمِ نشاطِ زندگی

اے شبِ سرد و زلفِ درازِ آگہی — اے چراغِ مردۂ محرابِ امن و آشتی

اے متاعِ بردۂ گیتا و قرآں السلام

السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

تو ہی اک دانائے کامل بزمِ نادانی میں تھا — روشنی کا تو منارہ بحرِ طوفانی میں تھا

تیرے دم سے زمزمہ گنگا کی جولانی میں تھا — نغمہ تجھ سے کوثر و تسنیم کے پانی میں تھا

اے عزیزِ ہندو و فخرِ مسلماں السلام

السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

اور میں نہ جانے کتنی دُور تک ان اشعار کو گنگناتا چلا گیا۔

اگلی صبح ریل حیدرآباد جا پہنچی وہاں اسٹیشن پر ڈاکٹر زور، خواجہ حمید الدین شاہد اور حضرت ضامن بخاری موجود تھے۔ ڈاکٹر زور کی تصویر ہم لوگ "آج کل" میں شائع کر چکے تھے۔ لہٰذا انھیں پہچاننے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ ڈاکٹر زور نے مجھے کس طرح پہچان لیا۔ جوں ہی میں گاڑی سے اُترا وہ میری جانب بڑھے اور بولے "آپ ہیں جگن ناتھ آزاد"۔ میں اپنے پہچانے جانے پر بہت متعجب ہوا۔ ڈاکٹر زور نے پروفیسر شاہد اور ضامن صاحب کا تعارف کرایا۔ حضرت شاہد کے نام سے تو میں پہلے ہی سے آشنا تھا۔ ہاں ضامن صاحب کے نام سے شناسائی نہ تھی۔ لیکن ایک دوسرے ذریعے سے جب تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ میرے لئے بالکل اجنبی نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ آپ محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر کے شوہر ہیں۔ بشیر صاحبہ کا مجموعۂ کلام "آبگینۂ شعر" میں کچھ مدت پہلے دیکھ چکا تھا۔ اور اُن کے کلام کا معترف ہو چکا تھا۔ لہٰذا اسٹیشن کی تینوں ملاقاتیں بیگانوں سے نہیں بلکہ اپنوں سے ہوئیں اور ایک منٹ تک وہیں باتیں کرنے کے بعد ہم لوگ زور صاحب کے دولت کدے کو روانہ ہوئے۔ رستے میں آپ ہر

چھوٹی بڑی عمارت۔ منظر یا تاریخی مقام کے متعلق مجھے کچھ نہ کچھ بتاتے گئے تھے کہ جب ہم گھر پہنچے تو حیدرآباد کا ایک دھندلا سا نقش میرے دل میں قائم ہو چکا تھا۔

گھر میں ناشتہ کرنے کے بعد شاہد صاحب اور رضامن صاحب تو اپنے اپنے کام کو چلے گئے اور ہم لوگ چادر گھاٹ آرٹس کالج میں پہنچے۔ زور صاحب اسی کالج کے پرنسپل ہیں۔ اسٹاف کے ممبروں سے ملاقات ہوئی۔ مجھے چونکہ پولیس ایکشن کے بعد ریاست میں اردو کی پوزیشن کا مطالعہ کرنے کا شوق تھا اس لئے یہیں سے اس مطالعہ کی ابتدا کی۔

حیدرآباد میں زبان کا مسئلہ بہت ٹیڑھی صورت اختیار کر چکا ہے۔ حیدرآباد کی اپنی علاقائی زبانیں تین ہیں۔ اگر ریاست کو شمالاً جنوباً دو حصوں میں تقسیم کریں تو مشرقی علاقے میں تلنگی کے سوا اور کوئی زبان نظر نہ آئے گی۔ اس زبان کے اثرات مدراس کے بعض سرحدی علاقوں تک چلے گئے ہیں۔ ریاست کا جو علاقہ بمبئی سے ملحق ہے اس میں مراٹھی بولی جاتی ہے۔ جنوبی علاقے کی زبان جس کی حدود میسور سے ملتی ہیں کنڑی ہے۔ لیکن اس علاقے میں کنڑی اپنی ادبی صورت میں نہیں بلکہ دیہاتی صورت

موجود ہے۔ کینڑی کا ادبی اور منجھا ہوا رنگ روپ میسور میں دیکھنے میں آتا ہے۔ ریاست کے اونچے طبقے میں خواہ وہ کسی حصے کا ہی کیوں نہ ہو انگریزی مستعمل ہے۔ اس کے علاوہ شہروں اور دیہات میں اردو بڑی بے تکلفی سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ریاست کے اسٹیشنوں پر خوانچے والے اور قلی صاف ستھری اردو میں بات چیت کرتے ہیں۔ اسے آپ ہندی کہہ لیں یا ہندوستانی لیکن یہ زبان وہی ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں مستعمل ہے اور جس کی جگہ ہندوستان کی کوئی مصنوعی زبان نہیں لے سکتی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم ہندوستانی ہے۔ پولیس ایکشن سے پہلے اسی کو غالباً اردو کہتے تھے۔

تو اس صورت حال کے پیشِ نظر ایک طالب علم کے لئے اسکول یا کالج میں آکر یہ فیصلہ کرنا کہ وہ کون سی زبان اپنے مضمون کے طور پر اختیار کرے۔ بہت ہی مشکل مسئلہ ہے۔ ہندی اہلِ ریاست کے لئے ابھی تک ایک بیرونی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ اس کے لئے فضا پیدا کی جارہی ہے لیکن اس وقت تک صورت یہ ہے کہ وہاں کے ہندی اخبار "ملاپ"

کو بڑی کوششوں کے باوجود ریاست بھر میں ہندی کا کوئی اسسٹنٹ ایڈیٹر نہیں مل سکا۔ اور اخبار کے ایڈیٹر شری یدھ ویر تنہا اس اخبار کو مرتب کر رہے ہیں۔ اس حقیقت کا انکشاف خود شری یدھ ویر کی زبانی ہوا۔ لہٰذا اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ شری یدھ ویر نے بتایا کہ دو چار حضرات دفتر میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کا کام کرنے کے لئے آئے لیکن وہ الفاظ کے صحیح ہجے بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ سن کر میں نے کہا کہ پھر آپ کیوں اس بکھیڑے میں پڑتے ہیں۔ جو زبان ریاست کی زبان نہیں آپ کیوں اُسے ریاست پر ٹھونسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ اپنی ساری توجہ اُردو ملاپ پر مرکوز کریں۔ کیونکہ مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ہی اس ریاست کی زبان ہے۔ اس پر آپ ہنس پڑے۔ میں منتظر رہا لیکن آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی ایک ایسی درس گاہ ہے جو ہندوستان بھر میں ایک امتیاز مقام رکھتی ہے۔ یہ ہندوستان کی پہلی یونیورسٹی ہے جس نے اپنی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا۔ اور ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر محی الدین اور ڈاکٹر زور الدین ایسی شخصیتوں کو پیدا کیا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری سے ملنے

کی تمنّا مجھے کشاں کشاں اس یونیورسٹی میں لے گئی۔ انھیں میرے آنے کی اطلاع پہلے مل چکی تھی۔ بڑی محبت سے ملے اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آپ نے یونیورسٹی کے ڈین پروفیسر دورا سوامی سے ملایا۔ پروفیسر دورا سوامی ایک مدراسی ہیں۔ اور بہت خوش خلق انسان ہیں۔ وہیں یہ فرمائش ہوئی کہ میں پرسوں یونیورسٹی میں "ہندوستان میں اردو کا مستقبل" کے موضوع پر تقریر کروں۔ اور اپنا کلام سناؤں۔ یونیورسٹی کے اسٹاف اور اردو کے تمام طلبہ سے ملنے کا یہ ایک بہت اچھا ذریعہ تھا۔ چنانچہ میں آمادہ ہو گیا۔

وہاں سے فارغ ہوئے تو پروفیسر شاہد یونیورسٹی لائبریری دکھانے لے گئے۔ جناب مسعود یزدانی لائبریرین سے ملاقات ہوئی۔ آپ جناب غلام یزدانی ناظم آثارِ قدیمہ کے فرزند ہیں۔ میں جناب غلام یزدانی کے نام سے آشنا تھا۔ اگرچہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی لہٰذا مسعود صاحب سے مل کر خاص مسرت حاصل ہوئی۔ آپ نے لائبریری کی ایک ایک الماری اور ایک ایک شیلف دکھایا۔ قلمی مسوّدے اس لائبریری میں بڑی بھاری تعداد میں موجود ہیں۔ انھیں تفصیل سے دیکھنے کے لیے کئی دن چاہییں۔

اور ہمارے پاس تو چند لمحات تھے۔ کیا کیا دیکھتے۔ تمنا ہی دل میں لے کر واپس آ گئے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مگر پھر بھی مرے ارمان کم نکلے

اس لائبریری میں ستر ہزار کتابیں ہیں۔ اور تیس ہزار کتابیں جو نوّاب سالار جنگ مرحوم کا عطیہ ہیں ایک اور عمارت میں رکھی گئی ہیں، یہ کتابیں عنقریب اس بڑی عمارت میں منتقل کر دی جائیں گی۔

یونیورسٹی میں جو ملاقاتیں ہوئیں اُن میں ایک قابلِ ذکر ملاقات پنڈت ونشی دھر سے ہوئی۔ پنڈت جی ہندی کے پروفیسر ہیں۔ اچھی اُردو جانتے ہیں۔ اور ہندوستان میں زبان کے مسئلے کا آپ نے اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ آپ ہندی میں شعر بھی کہتے ہیں۔ اگلے دن کی نشست میں جس کا ذکر میں ابھی کروں گا۔ آپ نے ہندی کلام سنایا جس کے متعلق میری رائے آج بھی یہی ہے کہ یہ اُردو کلام ہے۔ لیکن پنڈت جی اسے یقیناً ہندی شاعری کہتے ہوں گے۔ میں حیران ہوں کہ اگر پنڈت ونشی دھر کی شاعری ہندی شاعری ہے تو پھر اُردو اور ہندی والوں میں جھگڑا کس بات کا ہے۔ یہ

شعر غالباً اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے:-

از تعصّب ساغرِ شیخ و برہمن شد جدا

ورنہ در میخانہ یک ساقی و یک جام است بس

شام کو چادرگھاٹ آرٹس کالج کے طلبہ اور اسٹاف کے درمیان میچ ہوا جس میں اساتذہ کرام ایک گول سے ہار گئے۔ یہ میچ بہت پُرلطف رہا اور پروفیسر صاحبان کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے میچ کے بعد چائے کی دعوت میں شریک ہوئے۔ اور اکثر نے تو اپنے زورِ بیان سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اگرچہ ہم ایک گول سے ہار گئے ہیں لیکن جیت پھر بھی ہماری ہے۔ کیوں کہ طلبہ تو ہر روز مشق کرتے ہیں اور ہم مدت کے بعد کھیلے۔ دلیل بہت معقول تھی لیکن شکست کو فتح میں تبدیل نہ کر سکی۔

اگلے دن پھر کچھ وقت چادرگھاٹ کالج میں بسر کیا۔ اس تنگ نظری اور کم ظرفی کے دور میں اس کالج کا ماحول دیکھ کر دل کو انتہائی مسرت حاصل ہوئی۔ کالج کے اسٹاف اور طلبہ میں محبت اور یگانگی کا ایک قابلِ تعریف رشتہ نظر آیا۔ زور صاحب کی مصروفیات دیکھیں تو تعجب ہوا کہ کالج کے کام میں اس قدر مشغول اور منہمک رہنے کے باوجود آپ علمی

ادبی اور تنقیدی مضامین کیسے لکھ لیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ کالج کے طلبہ یا اسٹاف کے ممبر کوئی بھی مسئلہ لے کر آپ کے پاس آئیں آپ بڑی توجہ سے سنتے ہیں۔ اور ایک دفتری یعنی انتظامی انداز سے اس کے ہر پہلو پر سوچ بچار کر کے اس کا حل نکالتے ہیں۔

کالج میں کچھ وقت بسر کرنے کے بعد میں پروفیسر مجید الدین کی معیت میں شہر کی سیر کو نکلا۔ مکہ مسجد۔ چار مینار۔ فتح میدان اور دیگر قابل دید مقامات دیکھنے کے بعد ہم کتب خانہ آصفیہ میں پہنچے۔ اس کتب خانہ کے مہتمم ڈاکٹر راحت اللہ سے ملاقات ہوئی۔ آپ ایک علم دوست شخصیت ہیں۔ اور ہندوستان کے مشترکہ تمدن کا ایک قابل تقلید نمونہ۔ آپ نے اس لائبریری کے مختلف حصوں کے متعلق واقفیت بہم پہنچائی۔ قلمی نسخوں کی اس لائبریری میں بھی کمی نہیں۔ قرآن مجید کے ایسے نادر قلمی نسخے دیکھنے میں آئے کہ اُن کی تعریف حدِ امکان سے باہر ہے۔ ایک نسخہ نہایت چھوٹے سائز پر اتنے باریک کاغذ کا تھا کہ اُسے ہاتھ لگاتے ہوئے یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں میلا نہ ہو جائے۔ تعجب ہے کہ خوش نویس نے اس ذرا سے نسخے میں کلام پاک کی ساری عبارت لکھ دی۔ اکثر قلمی

نسخوں میں سونے کا کام بڑی کثرت سے کیا ہوا نظر آیا۔

آج چار بجے کالج میں والی بال کا میچ تھا لیکن طلباء و پروفیسروں کے درمیان نہیں بلکہ طلبہ کا باہمی مقابلہ تھا۔ دونوں طرف کے طلبہ کا کھیل معیاری تھا اور اس بات سے اطمینان ہوا کہ کالج میں درس و تدریس کے ساتھ ہی ساتھ کھیل کود کو بھی پوری اہمیت دی جارہی ہے۔

شام کو ڈاکٹر زور کی قیام گاہ پر ایک ادبی نشست منعقد ہوئی اور اس میں تقریباً تمام شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات ہوگئی اس نشست کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کسی ایک ہی مدرسۂ فکر کے حضرات شریک نہیں ہوئے بلکہ شہر کی تقریباً تمام ادبی انجمنوں سے تعلّق رکھنے والے اصحاب نے شرکت کی۔ جہاں تک میرا خیال ہے کوئی تیس کے قریب حضرات اس میں شریک ہوئے بعض حضرات کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں وہ میں یہاں درج کرتا ہوں۔

راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی۔ جناب انیس الرحمٰن مدیر "شعیب" خواجہ حمید الدین شاہد۔ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ جناب عاقل علی خاں

جناب میر حسن ۔ ڈاکٹر زور ۔ مرزا ضامن علی بخاری ۔ ڈاکٹر حسین ظہیر ۔ جناب اشفاق حسین ۔ جناب کنول پرشاد کنول ۔ جناب حمایت علی شاعر ۔ شری یدھ ویر ایڈیٹر ملاپ ۔ محترمہ جہاں بانو ۔ محترمہ مسز اختر حسین اور محترمہ رضیہ بیگم ۔

یہ نشست نہایت معیاری اور شستہ تھی ۔ اور حیدرآباد میں اردو کی معیاری نشست کا منعقد ہونا کوئی بڑی بات بھی نہیں ۔ ہاں بڑی بات یہ تھی کہ بقول میزبان پولیس ایکشن کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ حیدرآباد کے اردو شعراء اور ادباء ایک مرکز پر جمع ہوئے تھے ۔ اور انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا ۔

مسز اختر حسین نے اختر صاحب کی علالت کا ذکر کیا ۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ شاہد صاحب کے ہمراہ مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوں گا لیکن مجھے افسوس ہے کہ مصروفیات بڑھ جانے کے باعث میں ان کے دولت کدے پر حاضر نہ ہو سکا ۔ اور ابھی تک خط لکھ کر ان سے معذرت بھی نہیں کر سکا ۔

رات کے کھانے کی دعوت محترمہ بشیر النساء بیگم کی جانب سے

سے تھی۔ وہاں کھانے کے بعد شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور بارہ بجے کے قریب ہم لوگ گھر واپس لوٹے۔

شام کی نشست کے بعد جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے اگلے دن کا پروگرام طے ہوا۔ اور وہ پروگرام اس قدر مصروفیات سے پُر تھا کہ شام تک تمام کاموں کا مکمل ہو جانا ایک معجزے سے کم نہ تھا۔

حضرت امجد اس نشست میں تشریف نہیں لائے تھے۔ اُن کی رباعیات میں ایک مدت سے پڑھتا چلا آرہا تھا۔ اُن سے ملاقات کی بڑی آرزو تھی۔ اس کے علاوہ عثمان ساگر اور گولکنڈے کے مقابر دیکھنے کی بھی بڑی تمنا تھی۔ عثمان ساگر شہر سے کوئی پندرہ میل دور ہے۔ اور گولکنڈے کے مقابر بالتفصیل دیکھنے کے لئے کم از کم ایک دن چاہیئے۔ ان مصروفیات میں اضافہ یوں ہوا کہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نے یونیورسٹی گرلز کالج میں کلام پڑھنے کی فرمائش کی۔ اُن کی فرمائش کو قبول نہ کرنا آسان کام نہ تھا۔ ڈیڑھ بجے کے لئے میں عثمانیہ یونیورسٹی میں آنے کا وعدہ کر چکا تھا اور شام کے چار بجے چادر گھاٹ کالج میں بزم اردو کا افتتاح کرنے کی فرمائش ہوئی تھی۔ لہٰذا اس پروگرام کی تکمیل کے متعلق یوں طے پایا کہ صبح ساڑھے پانچ بجے

تیار ہو کر عثمان ساگر کا رُخ کیا جائے۔ ساڑھے سات بجے کے قریب ناشتہ وہاں کیا جائے۔ وہاں سے واپسی پر گورستان شاہی کی زیارت کریں۔ ساڑھے گیارہ بجے تک واپس آکر بارہ بجے یونیورسٹی گرلز کالج کا عزم کریں۔ وہاں سے ایک گھنٹے میں فارغ ہو کر ڈیڑھ بجے تک عثمانیہ یونیورسٹی پہنچیں۔ وہاں سے تقریر، شعر و شاعری اور چائے وغیرہ کے بعد چار بجے تک چادر گھاٹ کالج میں پہنچ کر بزمِ اردو کا افتتاح کیا جائے۔ وہاں سے ساڑھے پانچ یا چھ بجے تک آزاد ہو کر گھر پہنچیں اور مدراس جانے کی تیاری کریں۔ مدراس کی گاڑی آٹھ بجے روانہ ہوتی تھی لہذا پونے آٹھ بجے تک اسٹیشن پر پہنچنا لازمی تھا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پروفیسر شاہد نے یہ ذمہ داری لی کہ وہ حضرت امجد کو اپنے ہمراہ لائیں گے اور عثمان ساگر کی سیر میں وہ بھی شریک ہوں گے دوسری سب سے بڑی ذمہ داری انھوں نے یہ لی کہ مجھے صبح ساڑھے چار بجے ٹیلیفون کریں گے تاکہ میں ایک گھنٹے میں تیار ہو جاؤں۔ مجھے اتنی صبح جگانے کے لئے ٹیلیفون بہترین ذریعہ تھا۔ چنانچہ زور صاحب نے ٹیلیفون کی میز میرے پلنگ کے قریب سرکا دی۔ اب شوئی تقدیر دیکھئے کہ دن کے

وقت مجھے کچھ حرارت سی محسوس ہو رہی تھی، میں نے بخار کو روکنے کے لئے کونین کھالی۔ دن بھر چائے کے دور چلتے رہے۔ چائے میں نے اتنی زیادہ پی لی کہ رات کو نیند آنا دشوار ہو گیا۔ صبح ساڑھے چار بجے شاہد صاحب کے ٹیلیفون کا تصور سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ میں سونے کی جس قدر کوشش کرتا تھا نیند اسی قدر آنکھوں سے دُور بھاگتی تھی۔ حتیٰ کہ ساری رات نیند کو بلانے کی کوشش میں صرف ہو گئی۔ اور میں ساڑھے چار بجے تک کروٹیں ہی بدلتا رہا۔ عین وقت پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اب اس سے مجھے کیا مسرت ہوتی ساری رات آنکھوں میں بسر کرنے کے بعد اتنا طویل پروگرام کیسے مکمل ہوگا میں اس تصور سے کانپ اُٹھا۔ جسم اس وقت عثمان ساگر کی سیر کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ اب میرے نہ جانے سے ڈاکٹر زور۔ پروفیسر شاہد۔ حضرت ضامن۔ حضرت امجد ان سب کا پروگرام خراب ہو گا میں نے انکار نہ کیا۔ اور سب سے زیادہ مجھے زور صاحب کے بچوں کا خیال تھا جو ساڑھے پانچ بجے تک بالکل تیار ہو کر شوفر کو نیند سے جگا رہے تھے۔

میں بادلِ ناخواستہ تیار ہوا۔ اور کوئی چھ بجے ہم لوگ گھر سے چلے۔ ارادہ یہ تھا کہ طلوع کا منظر وہیں دیکھیں گے۔ رستے میں طے شدہ

مقام پر ہم نے پروفیسر شاہد جناب ضامن اور حضرت امجد کا انتظار شروع کیا۔ اُن کی موٹر آئی اور ہمارے قریب پہنچی ہی تھی کہ اس کا ایک پہیہ نکل گیا اور ایک بہت بڑا حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ حضرت امجد نزلے اور بخار کے باوجود تشریف لائے تھے ہیں اُن کی اس عنایت کا جس قدر بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔

اب گاڑی کی مرمت شروع ہوئی۔ ہم بھی اُن کے ساتھ رکنا ہی چاہتے تھے لیکن شاہد صاحب اور ضامن صاحب کے کہنے پر ہم انھیں وہیں چھوڑ کر اپنی منزل کو روانہ ہوئے۔ انھوں نے ہمیں یقین دلا دیا تھا کہ تھوڑی دیر میں گاڑی کی مرمت ہو جائے گی اور ہم لوگ پہنچ جائیں گے۔ اگر وہ یہ یقین نہ دلاتے تو ہم انھیں چھوڑ کر ہرگز نہ جاتے۔ کیوں کہ ناشتے کا سارا سامان اُن کی گاڑی میں تھا اور ہماری گاڑی میں شعر و شاعری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ امجد صاحب کو ہم نے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا اور بل کھاتی ہوئی سڑک سے ہوتے ہوئے عثمان ساگر پر جا پہنچے۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ عثمان ساگر کا منظر حقیقی طور پر ایک طلسماتی منظر تھا اس کا ذکر اب یہاں لاحاصل ہے۔ کیوں کہ اس کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا

تھا وہ اپنی نظم "عثمان ساگر" میں کہہ چکا ہوں۔ یہ نظم یوں شروع ہوتی ہے

نگاہوں کا سفینہ چھوڑ کر موجوں کے دھارے پر
کھڑا ہوں دم بخود عثمان ساگر کے کنارے پر

تھوڑی دیر تک تو ہم پہاڑی پر چڑھ کر موجوں کا نظارہ کرتے رہے اس کے بعد نیچے اترے اور پھولوں کی جلوہ گاہ کی جانب جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ درماندہ رفیقوں کی گاڑی آ پہنچی۔ اب قافلہ پل سے ہو کر پانی کے کنارے پتھروں پر فروکش ہوا۔ پروفیسر شاہد اور حضرت ضامن (اس وقت میزبان یہی حضرات تھے) تو ناشتے کو مکمل کرنے کے لئے ملازموں کا ہاتھ بٹانے لگے۔ بچے کھیل کود میں مصروف ہو گئے۔ اور ڈاکٹر زور، حضرت امجد اور راقم باتوں میں لگ گئے۔ ڈاکٹر زور نے مجھ سے فرمائش کی کہ وہ جو محل کی نشست میں تم نے غزل پڑھی تھی

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری

وہ سناؤ۔ اس وقت میرے جسم کا ایک ایک عضو نیند کے مارے درد کر رہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ اس وقت شعر و شاعری کا سلسلہ نہ چلے بلکہ یوں ہی باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن ڈاکٹر زور نے اس غزل کے وہ ایک شعر جو پڑھے تو انھوں نے

"دیوانہ راہوئے بس است" کا کام کیا اور میں نے غزل شروع کی۔ آبِ رواں کے کنارے اس غزل نے خود مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دی اور میری جسمانی تکان آہستہ آہستہ رفع ہونے لگی جب میں غزل پڑھ چکا تو قریب قریب تازہ دم ہو چکا تھا۔ اب میں نے حضرت امجد سے گزارش کی کہ وہ کچھ رباعیات عنایت فرمائیں۔ انھوں نے ابتدا اس رباعی سے کی ؎

آنکھوں سے چھپے نگاہ سبحان اللہ

دل سے مخفی ہو آہ سبحان اللہ

پردہ کیا اس نے مجھ سے مجھ میں چھپ کر

کیا آڑ بنائی واہ سبحان اللہ

اتنی اچھی رباعی مدت کے بعد سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ چنانچہ جب انھوں نے دوسری رباعی شروع کی تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا ذرا رک جائیے۔ ابھی میں اسی رباعی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ پھر میں نے یہ رباعی دہرائی۔ حضرت امجد بڑے تعجب سے کہنے لگے کہ تم نے ایک بار سن کر یاد کر لی۔ میں نے کہا اچھے شعر کی یہی تو خوبی ہے اس

رباعی کے بعد آپ نے چند اور رباعیاں سنائیں جنھیں میں یہاں درج کرتا ہوں ؎

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے
مضمونِ بلند لامکاں سے لائے
ہر شعر بہ اعتبارِ فن خوب کہا
ہر شعر میں تاثیر کہاں سے لائے

عارض ہو کہ خدّ و خال میرا کیا ہے
نقصان ہو یا زوال میرا کیا ہے
مانا کہ میرا خیال ہی ہے سب کچھ
لیکن میرا خیال میرا کیا ہے

دُنیا میں یہ بدنصیب جیتے کیوں ہیں
افلاس کے یہ نقیب جیتے کیوں ہیں
ہے پیٹ کو ٹکڑا نہ بدن پر کپڑا
معلوم نہیں غریب جیتے کیوں ہیں

پیمانۂ زندگی کو بھرتے کیوں ہیں
سر چڑھ کے زمیں میں اُترتے کیوں ہیں
رکھ کر بھی تمام زندگی کے ساماں
معلوم نہیں امیر مرتے کیوں ہیں

مندرجہ ذیل رباعی کے متعلق آپ نے کہا کہ یہ میں نے ڈاکٹر اقبال کو بھیجی تھی۔ انھوں نے جواب میں لکھا تھا کہ آپ کی رباعی سے میں مسلسل تین دن تک مسرور ہوتا رہا ہوں اور وہ رباعی یہ ہے۔

ہیں مست مئے شہود تو بھی میں بھی
ہیں مدعیٔ نمود تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں
ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

حیدرآباد کے کسی رئیس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایک بار اس نے کھانے پر بلایا اور کھانے کے دوران میں مختلف طریقوں سے اظہار تمول کرتا رہا میں نے یہ رباعی اس وقت اسے سنائی۔

ڈیوڑھی نہیں در نہیں کہ دربان نہیں
بلبل نہیں گل نہیں کہ بستان نہیں
ہے جمع جہان بھر کا سامان گھر میں
خاطر جمعی کا کوئی سامان نہیں

اس رباعی کے سنتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور وہ کہنے لگا کہ آپ نے واقعی اس رباعی میں میری تصویر پیش کی ہے۔ میری دلی کیفیت ایسی ہی ہے اور مجھے بالکل خاطر جمعی میسر نہیں۔

اس اثنا میں ناشتہ تیار ہو چکا تھا۔ اب شعر و شاعری کو چھوڑ کر ہم کھانے کی جانب متوجہ ہوئے۔ باتوں کا سلسلہ ناشتے کے دوران میں جاری رہا۔ اور ہم لوگ جیسا کہ عام طور پر دعوتوں میں ہوتا ہے بہت زیادہ کھا گئے۔ امجد صاحب نے اس موقع پر کہا ؎

چبھتا ہے ہر ایک کی نظر میں
اچھا کپڑا بھی کیا بُرا ہے
کھا جاتے ہیں پیٹ سے زیادہ
اچھا کھانا بھی کیا بُرا ہے

ناشتے سے فارغ ہوئے تو نو بج چکے تھے۔ اب واپسی کی تیاری شروع کی۔ کوئی سوا نو بجے ہماری موٹریں گولکنڈے کو جا رہی تھیں۔

گولکنڈہ ـــــ یہ کسی شہر کا نام نہیں۔ یہ کوئی مقام نہیں بلکہ روئے زمین پر بکھری ہوئی داستانِ عبرت کا نام ہے۔ گولکنڈہ محض کھنڈروں کی دُنیا نہیں بلکہ تاریخ ہند کا ایک ایسا باب ہے جسے ہر دور کے سیّاح، مورّخ، شاعر، ادیب اور فن کار پڑھتے جائیں گے اور اس پر آنسوؤں کے موتی نچھاور کرتے جائیں گے۔

اس سرزمین پر قطب شاہی خاندان کوئی دو سو برس تک (سنہ [illegible]ء سے سنہ [illegible]ء تک) حکمراں رہا۔ اور یہ زمانہ دکن تو کیا سارے ہندوستان کی تاریخ میں ایک زرّیں عہد کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ اس خاندان کے عہد میں ہندوستان میں مشترکہ تمدّن کی بنیادیں اور زیادہ مضبوط ہوئیں اور اس کی بدولت اُردو نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی۔ اس دور میں اُردو کی ایسی بلند پایہ کتب لکھی گئیں جو ہماری تاریخِ ادب میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

یہ وہی سرزمین ہے جس کے متعلق اقبال نے کہا

بجے ۵

آہ جولاں گاہِ عالمگیر یعنی وہ حصار
دوش پر اپنے اُٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے
یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے
اپنے سکانِ کہن کی خاک کا دل دادہ ہے
کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے
خوابِ گہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا
دیدۂ عبرت! خراجِ اشکِ گلگوں کر ادا
ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے
مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر
جنبشِ مژگاں سے ہے چشمِ تماشا کو حذر
کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اُتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور
مضطرب رکھتی ہے جن کو آرزوئے ناصبور
قبر کی ظلمت میں ہے اُن آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک
کیا یہی ہے اُن شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیر جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال
اشک باری بہلنے ہیں یہ اُجڑے بام و در
گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشم تر
دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ اُمّت بھولنے والی نہیں

تو اس عبرت آباد میں ہم کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے تک پھرتے پھراتے رہے پروفیسر زور ہر گنبد اور مقبرے کے متعلق بڑی تفصیل سے واقفیت بہم پہنچاتے رہے میں تو انھیں فقط ایک ادیب سمجھتا تھا لیکن آپ میدانِ تاریخ کے بھی مرد نکلے۔

یہاں سے ناقابلِ بیان تأثرات لئے ہم گھر کو روانہ ہوئے۔ گولکنڈہ کے مقابر کوئی ایسی چیزیں نہیں تھیں کہ میں انھیں دیکھتا اور اُن کا میرے

دل پر اثر نہ ہوتا۔ اگرچہ اس عوامی دور میں حکومت کے متعلق نظریات بدل چکے ہیں لیکن ایک ہی مقام پر اس تعداد میں تاجداروں کی قبروں کو دیکھنا اور اُن سے متاثر ہوئے بغیر آنا میرے لئے ناممکن تھا۔ یہ موضوع بھی بار بار مصرعوں میں ڈھل کر میرے ذہن میں آیا لیکن ہر بار اقبال کی "گورستانِ شاہی" ایک رکاوٹ بن کر سامنے آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس موضوع پر لکھی ہوئی پندرہ بیس اشعار کی نامکمل نظم کو میں نے یہ کہہ کر ختم کیا کہ یہ موضوع اقبال کا حصّہ ہو چکا ہے اور اب اس پر کچھ کہنا میرے بس کی بات نہیں۔

گھر پہنچے تو سوا بارہ بج چکے تھے اور بارہ بجے ہمیں یونیورسٹی گرلز کالج میں پہنچنا تھا۔ فوراً شاہد صاحب کو ساتھ لیا اور کوئی ساڑھے بارہ تک کالج جا پہنچے۔ وہاں محترمہ جہاں بانو صاحبہ، اسٹاف کی دیگر ممبر اور طالبات منتظر تھیں۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ طالبات کے دل میں اردو کے لئے اس قدر ذوق وشوق دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی۔ جہاں بانو صاحبہ نے پرنسپل صاحبہ سے تعارف کرایا۔ اور پرنسپل صاحبہ نے طالبات سے۔ پرنسپل ایک انگریز خاتون ہیں۔ رسمیات ختم ہوئیں تو پروگرام شروع ہوا۔ میں نے ایک غزل پڑھی اس کے بعد ایک لڑکی نے فرمائش کی کہ کل ایٹ ہوم میں جو غزل پڑھی

تھی وہ سنائیے۔ ایٹ ہوم میں میں نے کئی غزلیں پڑھی تھیں لہٰذا پوچھنا پڑا کہ کون سی تو جواب ملا "دیوانوں پہ کیا گزری"۔ چنانچہ میں نے یہ غزل پڑھی اور جب پڑھ چکا تو بعض طالبات نے اُردو اور اس کے مستقبل کے متعلق کچھ سوالات دریافت کئے۔ سوال جواب کا سلسلہ ختم ہوا تو پھر غزل کی فرمائش ہوئی۔ میں نے تعمیل کی۔ اب ایک بجنے کو تھا اور ایک بجے مجھے عثمانیہ یونیورسٹی میں پہنچنا تھا۔ میں نے اجازت طلب کی لیکن پولیس ایکشن کے بعد طالبات کو پہلی بار اس طرح شعر سُننے کا موقع ملا تھا۔ انھوں نے کہا کہ جانے سے پہلے ایک غزل اور سنا کر جائیے۔ اب کے میں نے ایک غزل کے دو چار شعر سنائے۔ اور پرنسپل صاحبہ نے اختتامی تقریر کی جلسہ ختم ہوا اور میں اپنی کتابیں سنبھال ہی رہا تھا کہ کوئی سو کے قریب لڑکیوں نے گھیر لیا۔ یہ ہجوم آٹوگراف لینے کے لئے جمع ہوا تھا۔ میں نے بہت کہا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں میرا انتظار ہو رہا ہے۔ آپ اس وقت آٹوگراف کا سلسلہ بند رہنے دیں لیکن انھوں نے ایک نہ سُنی اور کہا کہ آٹوگراف لیے بغیر ہم آپ کو نہ جانے دیں گی۔ وقت کی کمی کے باعث اُن کی فرمائش کی تعمیل ممکن نہ تھی۔ اس موقع پر شاہد صاحب کی منت سماجت

بھی کسی کام نہ آئی اور مجھے آٹوگراف کے لیے رُکنا ہی پڑا۔ کوئی تیس
چالیس کتابوں پر ایک ایک شعر لکھنے کے بعد ہاتھ تھک گیا تو صرف دستخط
کرنا شروع کیے۔ لیکن لڑکیاں مُصر تھیں کہ دستخط کے ساتھ شعر کا ہونا
بہت ضروری ہے۔ آخر اُن سے میں نے یہ وعدہ کیا کہ اس وقت آپ
مجھے یونیورسٹی جانے دیں۔ مدراس جاکر میں چالیس پچاس مختلف
کاغذات پر دستخط سمیت اشعار لکھ کر آپ کو بھیج دوں گا۔ انھوں نے
میری بات مان لی اور مجھے اجازت دے دی۔ افسوس ہے کہ میں
اپنا یہ وعدہ ابھی تک پورا نہیں کرسکا۔ اب جب کبھی حیدرآباد جاؤں گا
تو ان سب سے اس کوتاہی کے لیے معافی مانگوں گا۔

ادھر سروری صاحب پریشان تھے۔ ڈیڑھ بج چکا تھا اور
میرا کوئی پتہ نہ تھا۔ انھوں نے دو ایک جگہ پر ٹیلیفون بھی کیا لیکن
کچھ پتہ نہ چلا۔ انھیں کیا خبر تھی کہ میں کہاں رُک گیا ہوں۔ جب
میں یونیورسٹی پہنچا تو بزمِ اردو کے اکثر ممبر باہر دروازے پر منتظر
تھے۔ میں کوئی چالیس منٹ دیر سے پہنچا تھا۔ لیکن جلسہ گاہ میں حاضرین
اسی طرح جمے بیٹھے تھے۔ انھیں غالباً اس امر کا احساس تھا کہ آنا وسد

میں ہے اور سفر میں وقت کی پابندی برقرار رکھنے میں کسی حد تک بے قاعدگی ہو ہی جاتی ہے۔ میں نے جاکر معذرت طلب کی اور دیر سے آنے کی تلافی یوں کی کہ تقریر کو سمیٹ کر پندرہ بیس منٹ کے گھیرے میں لے آیا تقریر کے دوران میں اردو کے متعلق کچھ سوال بھی ہوئے اُن کا جواب دینے کے بعد میں نے کوئی چار نظمیں اور غزلیں پڑھیں۔ میں اپنا کلام پڑھ ہی رہا تھا کہ گرلز کالج کی بعض طالبات جلسے میں شریک ہونے کے لیے آپہنچیں۔ حیدرآباد کے نئے ماحول میں اردو کی یہ ہردلعزیزی میرے لیے بہت حوصلہ افزا تھی۔ شعر و شاعری کا سلسلہ ختم ہوا تو آٹوگراف کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہاں بعض طلبہ کو آٹوگراف دینے کے بعد جب میں نے کہا کہ اب میں تھک گیا ہوں تو اکثر نے میری بات مان لی اور چلے گئے۔ ہاں بعض طلبہ پروفیسر سروری کے کمرے تک میرے ساتھ ساتھ رہے اور مجھے اُن کے سامنے ہار ماننا پڑی۔ اب تین بج چکے تھے۔ چنانچہ یہاں چائے پینے کے بعد میں چادرگھاٹ آرٹس کالج کو روانہ ہوا۔ وہاں معلوم ہوا کہ جارج برنارڈ شا کے انتقال کر جانے کی وجہ سے کالج میں چھٹی ہو چکی ہے۔ اس وقت جسمانی طور پر

مجھ میں مزید جلسوں میں شریک ہونے کی ہمت نہ تھی۔ اور اگر کسی اور وجہ سے کالج میں چھٹی ہوتی تو مجھے اطمینان سا ہوتا لیکن برنارڈ شا ایسے ادیب اور تمثیل نگار کے دنیا سے اُٹھ جانے سے بہت صدمہ ہوا اگرچہ شا اپنی عمر طبعی تک پہنچ کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود اس کوہ وقار فن کار کی موت کی خبر سن کر بے حد رنج ہوا۔ انگریزی تمثیل میں شا کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اب شاید ہی پُر ہو سکے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کالج میں پروفیسر زور میرے منتظر تھے۔ وہاں سے ہم گھر آئے اور دو ایک گھنٹے میں تیار ہو کر پونے آٹھ بجے کے قریب اسٹیشن پر پہنچ گئے کیونکہ مدراس کو گاڑی آٹھ بجے روانہ ہوتی تھی۔

حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے زمانے کی داستانیں مختلف جگہوں پر سنیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں لیکن ایک بات جو ہر زبان پر تھی اور جس کا کبھی کبھار دلی میں بھی ذکر سننے میں آ جاتا تھا یہ تھی کہ جب آر؟

میں پولیس ایکشن ہنر اگزالٹڈ ہائی نس نظام اور حکومت حیدرآباد کے کہنے سے ہوا۔ ثبوت اس کا مقامی لوگ یہ پیش کرتے تھے کہ حیدرآباد کی فوج نے کسی مقام پر بھی تو ہندوستانی فوج یا پولیس کا مقابلہ نہیں کیا۔ ہاں ریاست کے کمانڈر انچیف جنرل العدروس کی یہ کوشش رہی کہ ہندوستان کے تینوں کمانڈروں میں میجر جنرل چودھری ہی سب سے پہلے حیدرآباد میں پہنچیں کیوں کہ میجر جنرل چودھری حیدرآباد میں رہ چکے تھے۔ اور انھیں حیدرآباد کے اندرونی حالات سے کماحقہٗ واقفیت تھی اس کے علاوہ میجر جنرل چودھری نے حیدرآباد میں جنرل العدروس ہی سے فوجی تربیت حاصل کی تھی اور دونوں سپاہیوں میں استاد شاگرد کا رشتہ تھا۔

جنرل العدروس نے میجر جنرل چودھری کی رفتار کو باقی کمانڈروں کے مقابلے میں تیز تر کرنے کے لئے باقی دونوں اطراف میں رضاکاروں کے ذریعے سے دریاؤں کے بند تڑوا دیئے تھے جس سے مشرق اور جنوب سے آنے والی ہندوستانی افواج کی پیش قدمی میجر جنرل چودھری کی فوج کی بہ نسبت کسی قدر مدھم پڑ گئی تھی۔

ان داستانوں کے علاوہ حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے زمانے کے اور کوئی اثرات نظر نہ آتے تھے۔ ریاست میں ہندو اور مسلمان شیروشکر ہو کر زندگی بسر کر رہے ہیں اور ریاست کی قدیمی روایات کو ایک مقدس امانت سمجھ کر سنبھالے ہوئے ہیں۔ تاریخ حیدرآباد میں سے اگر رضاکار تحریک کے دو تین برس خارج کر دیئے جائیں تو باہمی میل جول کے اعتبار سے یہ تاریخ اتنی روشن اور بے داغ ہے کہ ہندوستان کی اکثر ریاستوں کے لئے نمونہ قرار دی جا سکتی ہے۔

پولیس ایکشن کی داستانوں کے علاوہ ایک اور تذکرہ بھی حیدرآباد میں ہر کہ و مہ کی زبان پر تھا۔ اور وہ تھا ریاست کے بارہ سزا یافتہ کسانوں کا معاملہ۔ ہر شخص کی تمنا یہ نظر آتی تھی کہ ہز اگزالٹڈ ہائی نس حکومت کے اس فیصلے پر نظرثانی کریں اور اگر معاملہ حکومت ہند کے ہاتھوں میں ہو تو پریذیڈنٹ اس فیصلے پر دوبارہ غور کریں۔

میری کوشش یہ رہی کہ ان بارہ قیدیوں کے جنہیں موت کی سزا کا حکم مل چکا ہے حالات تفصیل سے حاصل کروں۔ چنانچہ ادھر ادھر سے دریافت کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کے سوا اور کچھ نہ معلوم

ہوسکا کہ جب رضاکا تحریک نے ریاست میں زور پکڑا اور حضور نظام اور اُن کی حکومت نے اس کو روکنے کے لیئے کوئی قدم نہ اٹھایا تو ان لوگوں نے اس تحریک کا مقابلہ کیا اور ریاست کی امن پرور روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ یہ جذبہ لوگوں میں عام نظر آتا تھا کہ جیسے بھی ہو خواجہ احمد عباس۔ڈاکٹر ملک راج آنند اور مسٹر آر۔ کے کرانجیہ پرمشتمل ڈیفینس کمیٹی کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں۔ تاکہ ان گرفتار شدہ اشخاص کی رہائی کی کوئی صورت پیدا ہو سکے۔

ہاں تو میں ۲ر نومبر کو حیدرآباد سے روانہ ہوا۔ گاڑی چلی تو مجھے نیند آگئی اور بیزواڑہ پہنچنے سے پہلے آنکھ نہ کھُل سکی۔ بیزواڑہ گاڑی نو بجے پہنچی۔ یہاں آکر محسوس ہوا کہ میں جنوبی ہند کی حدود میں داخل ہو چکا ہوں اسٹیشن پر چائے کی جگہ کافی بک رہی تھی۔ ناشتہ منگوایا تو اس میں کو ئیکراوٹس کا پورا چ موجود پایا۔ ہر شخص تامل میں بات چیت کر رہا تھا۔ میں گاڑی سے اُترا، یہ دیکھنے کے لیئے کہ یہاں کے لوگ اُردو بھی سمجھتے ہیں یا نہیں۔ ایک اخبار والے سے پوچھا کہ تمہارے پاس کون کون سے اخبار ہیں اس نے تامل تلیگو اور انگریزی کے مختلف اخبارات کے نام گن

شملائے ہیں نے "مدراس میل" لے لیا۔ اسٹیشن کے ایک ملازم سے پوچھا کہ مدراس گاڑی کس وقت پہنچے گی۔ اس نے کہا کہ شام کے آٹھ بجے۔ اسی طرح دو ایک اور اشخاص سے بات چیت کی اور یہ دیکھ کر یک گونہ اطمینان ہوا کہ اُردو میں لوگ بڑی بے تکلفی سے بات چیت کر لیتے ہیں یہاں اسٹیشن پر اردو کے متعدد رسائل بھی بک رہے تھے۔ افسوس ہے کہ ان حقائق کے باوجود ہندوستان کے اکثر لوگ اُردو کو ہندوستان کی بھاشا نہیں سمجھتے۔

بیزواڑہ سے مدراس تک کا سفر ذہنی طور پر کافی تکلیف دہ اور وقت آمیز ثابت ہوا۔ ڈبے میں ہم تین آدمی تھے۔ ایک میں۔ ایک کوئی عمامہ و جبہ پوش بزرگ اور ایک ان کا کوئی عزیز جو ملازم زیادہ تھا اور عزیز کم۔ باقی تینوں مسافر بیزواڑہ اتر گئے تھے۔ یہ بزرگ دل کی بیماری میں مبتلا تھے۔ ڈاکٹر ان کے ہمراہ تھا۔ انھیں کوئی جلد کی بیماری بھی تھی چنانچہ ان کے جسم کو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد صاف کیا جاتا تھا۔ خیر یہ بات تو دقت آمیز نہیں تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ یہ صاحب بولتے بہت زیادہ تھے۔ اور میرے لئے لکھنا پڑھنا یا سوچنا قریب قریب

دشوار ہو گیا تھا۔ نہ جانے "عثمان ساگر" "گولکنڈے کے مقبروں میں" اور چند رباعیات میں نے اس سفر کے دوران میں کیوں کر کہہ لیں۔ ان حضرت نے اس بات کا کوئی خیال نہیں کیا کہ ایک رفیق سفر ہمراہ ہے وہ لکھنے پڑھنے میں مصروف ہے اس کا کچھ لحاظ کیا جائے۔ انھوں نے مجھے تو خیر پریشان کیا ہی اپنے عزیز اور ڈاکٹر کو بھی کچھ کم زچ نہیں کیا۔ غالباً یہ کوئی بہت امیر آدمی تھے۔ اور ان کے تمام اعزہ (جو ساتھ کے ڈبے میں تھے) اور معالج کو ان کی خاطرداری کا بڑا لحاظ تھا۔

مدراس جاتے ہوئے رستے میں میلوں تک پھیلی ہوئی زمینیں نظر آئیں جن پر کھیتی باڑی کا نام ونشان نہیں تھا۔ میں حیران تھا کہ حکومت کی "زیادہ اناج اگاؤ" کی اسکیم کو عملی جامہ کیوں نہیں پہنایا جا رہا۔ کیا یہ اسکیم فقط دفتر کی فائلوں تک ہی محدود رکھنے کے لئے بنائی گئی ہے لیکن مدراس جا کر زمینوں کے اس طرح بے مصرف پڑے رہنے کی وجہ معلوم ہوئی۔ وہاں دوستوں سے بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ بندش شراب کے فیصلے پر عمل درآمد کرنے سے احاطۂ مدراس کو ریونیو میں سترہ کروڑ روپے کا خسارہ ہوا ہے اس کے علاوہ قریباً چار کروڑ روپیہ اس اسٹاف پر خرچ ہو رہا ہے جو بندش شراب

کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مقرر کیا گیا ہے اب اکیس کروڑ روپئے کے خسارے کے بعد حکومت میں یہ دم نہیں رہا کہ صوبے میں آب پاشی کے کام کی جانب توجہ دے سکے ۔ اور جب تک آب پاشی سائنٹیفک لائنوں پر نہ کی جائے زراعت قریب قریب ناممکن ہے ۔

یہاں تاڑی کے درخت قدم قدم پر نظر آئے ۔ اور مجھے بتایا گیا کہ ان اشجار سے شراب کی ناجائز کشید زوروں پر ہے ۔ اس ناجائز کشید سے ایک تو حکومت کو کروڑوں روپئے کا نقصان ہو رہا ہے دوسرے لوگوں میں چوری کی عادت زور پکڑ رہی ہے ۔ اس کے علاوہ یہ گھریلو شراب جو شمشیر براں سے کم نہیں پینے والوں کی صحت کو تباہ کر رہی ہے۔

تاڑی کے اشجار کی تصاویر میں نے اکثر دیکھی تھیں اور مجھے یہ کبھی پسند نہیں آئی تھیں لیکن اب ان اشجار کو اپنے صحیح روپ میں میدانوں میں دیکھا تو ان میں ایک عجیب کیفیت نظر آئی ۔

ان مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہوا میں شام کے آٹھ بجے مدراس جا پہنچا ۔ سید حامد اشرف کو میں نے حیدرآباد سے اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی ۔ اُن کے ہمراہ گورنمنٹ آرٹس کالج کے چند اور طلبہ اسٹیشن پر موجود

پہنچے۔ اسٹیشن سے ہم لوگ سید عبد الوہاب بخاری کے مکان پر پہنچے۔ میرے قیام کا انتظام یہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ آج کی دعوت ڈاکٹر مولانا عبد الحق پرنسپل پریزیڈنسی کالج مدراس کی طرف سے ہے اور وہ اپنے دولت کدے پر منتظر ہیں۔ سامان وغیرہ وہاں اُتارا گیا۔ اور اشرف صاحب اور میں اُسی گاڑی میں ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ سفر کی کیفیت دریافت کی۔ والد کا مزاج پوچھا اور بہت دیر تک والد، ڈاکٹر اقبال، شیخ سر عبد القادر اور "مخزن" کے دور اول کا ذکر کرتے رہے۔ وہاں اور لوگ بھی کھانے پر مدعو تھے۔ جن میں سے پروفیسر آغا حیدر اشرف دہلوی اور پروفیسر ایم۔ اے ندوی کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر جائے قیام پر آئے۔ پروفیسر بخاری "خانہ بہ مہماں گزاشت" کے مصداق میرے پہنچنے سے ایک دن پہلے کسی ضروری کام سے حیدرآباد چلے گئے تھے۔ اُن کے فرزند موجود تھے۔ آپ پریزیڈنسی کالج میں طالب علم ہیں اور امتحان کی تیاری کے باوجود آپ نے توجہ اور مہماں نوازی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔

میں سفر کا تھکا ہوا تو تھا ہی، آتے ہی سو گیا۔ صبح چھ بجے آنکھ کھلی اور نہا دھو کر آٹھ بجے تک تیار ہو گیا۔ یہاں میرے آنے سے پہلے اشرف صاحب کے پاس خطوط جمع ہو چکے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں ان کا جواب دینے بیٹھ گیا۔ ناشتے کے وقت ایک نئی شخصیت سے ملاقات ہوئی۔ یہ تھے پروفیسر محمد حسین۔ آپ یونیورسٹی آف ٹراونکور میں اسلامک ہسٹری کے پروفیسر ہیں۔ ان کی ڈاڑھی دیکھی تو سمجھا کوئی زاہد خشک ہوں گے اور ہر وقت مذہب کی باتیں کر کے پریشان کریں گے لیکن تھوڑی ہی دیر میں یہ اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ آپ تو دریائے لطافت نکلے۔ بات میں بات پیدا کرتے تھے۔ اور جتنے دن میں مدراس میں رہا آپ کی بدولت وقت بہت اچھی طرح سے بسر ہوا۔

کوئی بارہ بجے اشرف صاحب اس نیت سے آئے کہ قابلِ دید مقامات کی سیر کریں گے لیکن میں نے یہ کہہ کر انہیں رخصت کر دیا کہ آج رات کو مشاعرہ ہے آپ انتظامات وغیرہ میں مصروف ہوں گے لہٰذا آج آپ کالج ہی میں رہیے۔ سیر وغیرہ کا پروگرام مشاعرہ کے بعد طے کریں گے۔ وہیں اردو ایسوسی ایشن کے اراکین تشریف لاتے رہے کوئی ڈیڑھ بجے کے

قریب "ڈیلی ایکسپریس" کے مقامی نمائندہ جناب عدنی تشریف لائے۔ ان سے آدھ گھنٹے تک بات چیت کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ آپ اردو سے بالکل ناواقف ہیں چنانچہ بڑا تعجب ہوا کہ جب اردو بالکل نہیں جانتے تو مجھ سے ملنے کیوں آئے ہیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا اُن سے پوچھ ہی لیا کہ آپ اردو بھی کچھ جانتے ہیں تو معلوم ہوا کہ آپ کو اردو سے خاصی دلچسپی ہے بالخصوص اردو جرنلزم سے۔ اب یہ جاننے کے بعد انگریزی میں بات چیت محض تکلف تھا۔ لہٰذا اردو میں گفتگو شروع ہوئی۔ آپ شمالی ہند اور پاکستان میں اردو جرنلزم کے متعلق سوالات پوچھتے رہے۔ پاکستان کے متعلق تو میری واقفیت کم تھی (انقلابات میں زمانے کے) شمالی ہند کے متعلق جب میں نے انھیں بتایا کہ یہاں اردو کے اخبارات کی اشاعت پندرہ پندرہ بیس بیس ہزار ہے اور دہلی میں دو ماہنامے ایسے ہیں ("شمع" اور "بیسویں صدی") جو ساٹھ اور تیس ہزار چھپتے ہیں تو آپ کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ آپ نے شام کو سدرن انڈیا جرنلسٹس فیڈریشن کے دفتر میں آنے کی دعوت دی۔

چنانچہ شام کو وہ آئے اور مجھے اپنے ہمراہ لے گئے۔ وہاں تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ہم ساحلِ بحر کی سیر کو نکلے۔ دامنِ ساحل میں موجوں کا رقص

ایک عجیب سماں پیدا کر رہا تھا۔ بعض مقامات پر تو لہریں اتنے زور سے اور اس قدر بلند اٹھ رہی تھیں کہ اس طوفانی کیفیت کو دیکھ کر خوف آتا تھا یہ رباعی وہیں موزوں ہوئی ؎

یہ بحر میں طوفاں کا نظارا اے دل!
کیا بات ہے کیوں نہیں گوارا اے دل!
تو ذوقِ نگاہ سے ہے عاری ورنہ
ہر موج بنے ترا کنارا اے دل!

رات ہوئی تو ہم گھر واپس لوٹے۔ دوپہر کو بنگلور سے دو شعراء تشریف لا چکے تھے۔ ایک جناب محمد افضل تابش مدیر روزنامہ "پاسبان" اور دوسرے لالہ خوب چند۔ ملاقات ان سے یہاں ہوئی۔ کلام ان کا مشاعرے میں سُنا۔

رات کے کھانے میں مہمانوں کی کمی نہ تھی۔ صرف میزبان غائب تھے۔ کھانے کے بعد ہم لوگ اشرف صاحب کا انتظار کرنے لگے۔ کیونکہ انھیں آ کر ہمیں مشاعرہ میں لے جانا تھا۔ نو بجے کے قریب اردو ایسوسی ایشن کے دو تین اراکین کے ہمراہ اشرف صاحب آئے اور ہمیں مشاعرہ گاہ میں

لے گئے۔

گورنمنٹ آرٹس کالج کا ہال دوسری منزل پر ہے اور اسی میں مشاعرہ منعقد ہو رہا تھا۔ ہم پہنچے تو ڈاکٹر عبدالحق۔ پروفیسر زیدی اور دیگر حضرات ہال کے دروازے پر موجود تھے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے اسٹاف روم میں بیٹھے۔ اتنے میں وزیر تعلیم شری مادھو امینن تشریف لائے۔ ان سے ملاقات ہوئی اور ہم ہال میں پہنچے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اوپر سامنے کا ڈائس خواتین کے لئے وقف تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ معززین شہر مشاعرہ گاہ میں بڑی بھاری تعداد میں موجود ہیں۔ ہال بھر جانے کی وجہ سے دروازوں اور برآمدوں میں بھی شائقین جوق در جوق موجود تھے۔ مشاعرے کا افتتاح شری مادھوامینن نے کیا۔ آپ نے کہا:-

شعر و نغمہ نے بنی نوع انسان کی تربیت نفس میں جو کام کیا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور مشاعرہ شعر و نغمہ کا ایک ایسا مظاہرہ ہے جس کی پشت پر سالہاسال کی روایات چلی آتی ہیں۔ مشاعرے کے انعقاد سے صرف شعرا کی عزت افزائی ہی نہیں ہوتی بلکہ اس سے فن شعر کے ارتقاء کا مقصد

بھی حل ہوتا ہے۔

مشاعرہ ویسے بھی ہمارے تمدن کا ایک خوبصورت جزو ہے اور آج کا مشاعرہ تو اس لئے بھی خاص طور پر اہم ہے کہ اس کے ساتھ ایک نہایت مفید مقصد وابستہ کر دیا گیا ہے اور وہ مقصد ہے کالج کے غریب طلبہ کی امداد۔"

اس افتتاحی تقریر کے بعد جناب فضل اللہ ایکٹنگ پرنسپل نے شعراء کو خوش آمدید کہا۔ اور قریباً دس بجے مولانا عبدالحق کی زیر صدارت مشاعرہ شروع ہوا۔ آپ نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو شاعری کی ہر دور کی تدریجی ترقیوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا۔ مشاعرے اور اُن کی افادیت پر ایک نظر ڈالی اور مشاعرے کی کارروائی شروع کی۔ ابتدا تلاوت کلام پاک سے ہوئی۔ اس کے بعد سید حامد اشرف نے شری سی راج گوپال آچاریہ (وزیر بغیر محکمہ مرکزی حکومت) شری پی۔ ایس کمار سوامی راجا چیف منسٹر مدراس شری کے سوامی نائکن پرنسپل گورنمنٹ آرٹس کالج اور مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے پیغامات پڑھ کر سنائے۔ شری سی راج گوپال آچاریہ نے اس موقع کے لئے ایک خاص نظم موزوں کی تھی جس

کا ترجمہ اُردو نظم میں پروفیسر رحیم احمد فاروقی نے کیا اور مشاعرہ میں سنایا اس نظم کا ایک بند اس وقت تک میرے ذہن میں محفوظ ہے اور اگر میں اس کا نثر میں ترجمہ کروں تو یوں کروں گا۔

بادشاہ نے اپنے لئے ایک مقبرہ بنوایا
تاکہ موت کے بعد اس میں ابدی نیند سو سکے
اور وہ مقبرہ ہے حسین تاج
اور جو شخص اپنے بھائی سے نفرت کرتا ہے
اپنی زندگی ہی میں اپنے لئے جہنم تیار کرتا ہے
اور وہ جہنم بدنمائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی
جیسے تاج حسن و نفاست میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

مشاعرے کا تفصیلی ذکر لاحاصل ہے۔ صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ یہ مشاعرہ شمالی ہند کے اچھے اور کامیاب مشاعروں سے کسی حیثیت میں کم نہیں تھا۔ صدر کے شگفتہ فقرے مشاعرے میں جان ڈال رہے تھے۔ آپ کا سنجیدہ اور کبھی کبھی مزاحیہ انداز بیان مشاعرے میں ایک خاص کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ شعرا باری باری اپنا کلام سنا رہے تھے۔

حاضرین موقع اور محل کے مطابق داد دے رہے تھے۔ اخبارات کے رپورٹر رپورٹیں لینے میں محو تھے اور فوٹوگرافر تصاویر لینے میں۔ یہ پُر لطف محفل صبح کے ڈیڑھ بجے تک جاری رہی اور اس کی کامیابی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ جب تک صدر نے مشاعرے کو ختم کر دینے کا اعلان نہ کیا حاضرین اپنی اپنی جگہ پر جمے رہے اور کوئی شخص مشاعرہ کو چھوڑ کر نہ گیا۔ منتظمین اس کامیابی پر پھولے نہ سماتے تھے اور ان کی یہ مسرت اور خوشی بالکل مناسب اور موزوں تھی۔ مدراس میں اس قدر کامیاب مشاعرہ منعقد کرنا کوئی معمولی کامیابی نہ تھی۔ مشاعرے کے بعد یہاں بھی آٹوگراف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہال سے نکلتے نکلتے دو سوا دو بج گئے۔ کوئی تین بجے تک ہم ایسوسی ایشن کے اراکین کے ہمراہ اپنی قیام گاہ پر پہنچے۔ وہاں اپنے اپنے رنگ میں سب نے مشاعرے پر تبصرہ شروع کیا۔ کوئی پانچ بجے یہ سلسلہ ختم ہوا اور ہمیں سونا نصیب ہوا۔

اگلے دن اتوار تھا۔ کچھ اس خیال سے اور کچھ رات کو جاگنے کے باعث دیر سے بیدار ہوا۔ گیارہ بجے کے قریب جیمینی پکچرز کے گیسٹ ہا

شری منجیت سنگھ رانا جو اُردو کے اچھے شاعر ہیں۔ پنجاب ایسوسی ایشن کی طرف سے دعوت لے کر پہنچے۔ ایسوسی ایشن نے شام کو کلب میں بلایا تھا۔ شری منجیت وقتِ مقررّہ سے کچھ دیر پہلے آئے اور مجھے کلب میں لے گئے۔ وہاں ایسوسی ایشن کے ممبروں سے ملاقات ہوئی اور مجھے یہ دیکھ کر مسرّت ہوئی کہ پنجاب ایسوسی ایشن کے ممبر صرف پنجابی ہی نہیں بلکہ غیر پنجابی بھی ہیں۔ موجودہ دور میں ایسی ہی انجمنوں کی ضرورت ہے جو صوبائی ملکی اور مذہبی تعصّب کی حدبندیوں کو توڑ کر بنی نوعِ انسان کو ایک ہی مرکز پر لائیں اور میں نے دیکھا کہ پنجاب ایسوسی ایشن یہ فرض بخوبی انجام دے رہی ہے یہاں میں نے اراکین کی فرمائش پر متعدد نظمیں اور غزلیں سنائیں اور کوئی ایک گھنٹے کے بعد نشست برخاست ہوئی۔ پنجاب ایسوسی ایشن کے ممبروں کی محبت اور ان کا حسنِ سلوک میری زندگی میں ہمیشہ ایک یادگار کی طرح رہے گا۔

وہاں سے فارغ ہو کر قیام گاہ پر پہنچے۔ حضرت تابش اور للا خوب چند بنگلور واپس جا رہے تھے۔ انھیں الوداع کہنا ضروری تھا۔ ان حضرات نے بنگلور آنے کی دعوت دی۔ رسمی دعوت نہیں بلکہ سچّی دعوت یعنی آپ نے

ایک باقاعدہ مشاعرے اور جلسے کا پروگرام طے کیا لیکن میرے پاس چونکہ وقت کم تھا اس لئے ان سے معذرت طلب کی اور انھیں الوداع کہی۔

جناب تابش اور خوب چند صاحب ابھی روانہ نہیں ہوئے تھے کہ ہمارے میزبان بخاری صاحب حیدرآباد سے تشریف لے آئے۔ آپ سے ملاقات ہوئی آپ نے آتے ہی مہمانوں سے اپنی غیر حاضری کی معذرت چاہی۔ آپ کی گھنی داڑھی دیکھ کر بھی مجھے وہی اندیشہ لاحق ہوا جو محمد حسین صاحب کی داڑھی دیکھ کر ہوا تھا۔ لیکن داڑھی نے دونوں موقعوں پر دھوکا دیا آخر اس دور میں داڑھیوں سے اور توقع ہی کیا کی جا سکتی ہے۔

یہاں سے فارغ ہوئے تو جناب منجیت ایک سینما گھر میں لے گئے وہاں تصویر دیکھنے کے بعد بے بی تبسّم اور اس کے والدین سے ملاقات ہوئی۔ بے بی تبسّم کی عمر سات برس کی ہے۔ لیکن اس کی اداکاری میں فن اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ جو تصویر ہم نے تھوڑی دیر پہلے دیکھی تھی اس میں بھی وہ کام کر رہی تھی۔ میں حیران ہوں کہ اس قدر کم عمر میں اس بچی نے یہ ذہانت اور تربیت کہاں سے حاصل کی۔ بے بی تبسّم کے والدین اردو سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں اور اردو کے متعدد اخبارات و رسائل اپنے

یہاں منگواتے ہیں۔ تصویر دیکھنے کے بعد یہ ہمیں اپنی جائے قیام اسٹینڈرڈ[1] ہوٹل میں لے گئے۔ وہاں بے بی نے چاکلیٹ اور ٹافیوں سے ہماری تواضع کی تھوڑی دیر بعد ان سے اجازت لے کر ہم اپنی قیام گاہ پر پہنچے۔

یہ تو میں کہنا بھول ہی گیا کہ جب آرٹس کالج کے مشاعرے میں پہلی غزل پڑھنے کے بعد میں اپنی جگہ پر آکر بیٹھا تو مولانا عبدالحق نے فرمایا کہ ۸ر کو ہم عثمانیہ کالج کرنول میں ایک مشاعرہ منعقد کر رہے ہیں۔ میری تمنا ہے کہ آپ اس مشاعرہ میں شرکت کریں۔ ڈاکٹر صاحب کی اس فرمائش کو قبول نہ کرنا بہت مشکل تھا۔ میں آمادہ ہو گیا اور طے پایا کہ ۷ر کو مدراس سے چلیں گے۔

۷ر کی صبح کے متعلق یہ بھی فیصلہ ہوا کہ طلوعِ صبح کا منظر سمندر کے کنارے دیکھیں گے چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے صبح کے ساڑھے پانچ بجے سیر کا انتظام مکمل کر لیا۔ میں ابھی سو ہی رہا تھا کہ پانچ بجے منجیت صاحب نے آ جگایا۔ ہاتھ منہ دھو کر تیار ہوا کوئی آدھ گھنٹے میں ڈاکٹر صاحب کے فرزند انوار موٹر لے کر پہنچ گئے۔ راستے میں مختلف مناظرت الطف اندوز ہوتے

---

[1] ہوٹل کا نام مجھے صحیح طور پر یاد نہیں رہا۔ غالباً یہی نام تھا۔

ہوئے۔ ہم طلوع سے پہلے ساحلِ بحر پر جا پہنچے۔ تھوڑی دیر میں اُفق کے دامن میں بقول حفیظ ـــ

کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو

اور دیکھتے ہی دیکھتے نور کا ایک سیلاب ایک آتشیں گولے کو اپنے دامن میں لئے پانی کی سطح پر نمودار ہوا یہ منظر اس قدر حسین تھا کہ اسے بیان کرنا میرے بس میں نہیں۔ اسے دیکھتے ہی فانی کا یہ شعر یاد آیا ؎

ترے جلووں کے آگے طاقتِ شرحِ بیاں رکھ دی

زبانِ بے نگہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی

ہم کوئی پندرہ بیس منٹ تک یہ منظر دیکھتے رہے اس کے بعد ساحلِ بحر سے کچھ سیپیاں چن کر ڈاکٹر صاحب کے مکان پر آ گئے۔ وہاں چائے پی کر اسٹیشن پر پہنچے۔ کسی کو الوداع کہنا تھا اور ناشتے کے وقت تک اپنی قیام گاہ پر واپس لوٹ آئے۔

اب کے ناشتے میں بخاری صاحب بھی شریک تھے۔ اُنھوں نے اپنی خوش گفتاری سے اپنی طویل غیر حاضری کی تلافی کر دی آپ نے کہا کہ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ میں نے خود اکثر دوستوں کو شاعر

میں شرکت کی دعوت دی اور جب ان دوستوں نے دعوت قبول کرلی تو مجھے ایک ضروری کام سے مدراس چھوڑ کر حیدرآباد جانا پڑا۔

شام کو چار بجے گورنمنٹ آرٹس کالج کی اُردو ایسوسی ایشن کی جانب سے چائے، تصویر، تقریر اور کلام کی فرمائش تھی۔ منجیت صاحب اور جناب اشرف کے ہمراہ وہاں پہنچے۔ تمام کاموں سے کوئی سات بجے تک فارغ ہوگئے۔ کھانا رات کا ڈاکٹر عبدالحق کے ہاں تھا۔ وہاں سے ساڑھے آٹھ بجے فارغ ہوکر دس پندرہ منٹ میں اسٹیشن پر پہنچے اور نو بجے کرنول کو روانہ ہوگئے۔ اسٹیشن پر ایک فی البدیہہ رباعی ہوئی۔ اور وہ اس موضوع پر کہ جب سے مدراس کے اسٹیشن پر اُترا تھا طلبہ نے ہر موقع پر پھولوں کے ہار پہنانے میں کچھ بہت زیادہ فراخ دلی سے کام لیا تھا۔ رخصت کے وقت بھی یہی کیفیت تھی۔ چنانچہ روانہ ہوتے وقت میں نے ان سے کہا ؎

آزاد کو موہ لے لیا ہے تم نے
یوں اس پہ طلسم سا کیا ہے تم نے
کانٹوں میں حیات جس کی گزری ہے تمام
پھولوں سے اُسے لاد دیا ہے تم نے

گاڑی چلی تو میں سو گیا۔ صبح آٹھ بجے کے قریب بیدار ہوا۔ ہاتھ منہ دھو کر ناشتے سے فارغ ہوا۔ ساحلِ بحر پر طلوع کا منظر دل و دماغ پر اپنے مستقل نقوش چھوڑ گیا تھا۔ اب وہ نقوش صفحۂ قرطاس پر آنے کے لئے بے تاب تھے چنانچہ نظم کہنا شروع کی اور کرنول پہنچنے سے پہلے "مدراس کے ساحل پر" مکمل ہو چکی تھی۔

بارہ بجے کے قریب گاڑی کرنول پہنچ گئی۔ اسٹیشن پر عثمانیہ کالج کے پرنسپل اور اسٹاف کے بعض ممبر تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان سے تعارف ہوا اور ہم لوگ کالج کو چلے۔

یہ کالج جس میں اس وقت بلا امتیاز مذہب و ملت پانچ سو سے زیادہ طلبہ تعلیم پا رہے ہیں ڈاکٹر مولانا عبدالحق کی کوششوں کا نتیجہ ہے تعلیم کی دنیا میں ڈاکٹر عبدالحق کی خدمات اس قدر شاندار ہیں کہ وہ جنوبی ہند کے سرسید کے نام سے مشہور ہیں۔ کرنول ضلع کا صدر مقام ہے لیکن عثمانیہ کالج سے پہلے یہاں کوئی کالج نہ تھا۔ آپ نے تعلیم کے نام پر ملک کے متمول طبقے کے سامنے جھولی پھیلائی اور کرنول میں ایک ایسا پودا لگایا جو آج ایک شجر سایہ دار کی صورت اختیار کر چکا ہے اور جس کے سائے میں آج

ہندوستان کی نئی نسل پروان چڑھ رہی ہے

کالج کے پرنسپل مولوی محمدؐ میاں صاحب ایک شریف الطبع بزرگ ہیں۔ آپ بہار کے رہنے والے ہیں۔ دس بارہ برس تک یو۔پی کے محکمۂ تعلیم کی خدمت کی اس کے بعد مدراس میں محکمۂ تعلیم کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ یہاں آپ ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کے عہدے پر ریٹائر ہوئے اور ریٹائر ہونے کے بعد آپ نے اپنی خدمات عثمانیہ کالج کے سپرد کر دیں۔ عثمانیہ کالج خوش نصیب ہے کہ اُسے مولوی محمد میاں سا پرنسپل نصیب ہوا۔

مولوی صاحب نے کالج کا ماحول ہندوستان کی سیکولر اسٹیٹ کے شایانِ شان بنایا ہوا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اس میں ہر مذہب و ملت کے طلبہ تعلیم پا رہے ہیں بلکہ ہوسٹل میں جو دو کچن ہیں وہ ہندو اور مسلمان کے نام پر نہیں بلکہ ویجی ٹیرین اور نان ویجی ٹیرین کے نام پر ہیں اور میرے لیئے یہ بات بہت تعجب خیز تھی کہ جہاں نان ویجی ٹیرین کچن میں ہندوؤں کی خاصی تعداد موجود ہے وہاں ویجی ٹیرین میں مسلمان کافی تعداد میں موجود ہیں۔ کالج میں سائنس اور آرٹ دونوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ علمی اور ادبی سرگرمیاں کالج میں زوروں پر ہیں۔ ہر قسم کے کھیل کا معقول

انتظام ہے۔ مختصر یہ کہ عثمانیہ کالج کا وجود اس علاقے میں ایک رحمت سے کم نہیں جہاں اسے قائم کرنے کا سہرا ڈاکٹر مولٰنا عبدالحق کے سر ہے وہاں اسے بطرزِ احسن چلانا مولوی محمد میاں صاحب اور اُن کے رفقاء کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

کالج کے وائس پرنسپل سعید صاحب کالج کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کی روح رواں ہیں۔ میں نے دیکھا کہ طلبہ محبّت کی حد تک آپ کا احترام کرتے ہیں اور آپ بھی اُن کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ جس دن میں کرنول سے روانہ ہوا اسی دن مولوی محمد میاں صاحب اور آپ کوئی ایک سو کے قریب طلبہ کو ہمپی (وجے نگر) کے کھنڈر دکھانے کے لئے گئے۔ گویا تعلیم کے اس پہلو کو بھی پوری اہمیت دی جا رہی ہے۔

شام کو اس کالج میں مولوی محمد میاں کی زیرِ صدارت اسلامک ہسٹری ایسوسی ایشن کا اجلاس تھا۔ مجھ سے بھی اس میں نظم پڑھنے کی فرمائش کی گئی۔ چنانچہ میں بھی شریک ہوا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر عبدالحق نے علمِ تاریخ کی اہمیت پر ایک پُرمعنی تقریر کی۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد یہ اجلاس برخاست ہوا۔ اس کے بعد چائے کی دعوت تھی۔ اس سے فارغ ہوکر اپنے کمرے میں آئے اور بہت دیر تک مختلف حضرات سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

یہ دن کالج کا ڈنر ڈے تھا۔ طلبہ ڈنر میں شرکت کی دعوت لے کر آئے ہیں تو ہر حالت میں انھیں کا مہمان تھا۔ ڈنر میں شریک ہوا ہندو اور مسلمان طلبہ کو ایک ہی جگہ کھانا کھاتے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ گویا عثمانیہ کالج کے طلبہ نے اس راز کو سمجھ لیا ہے کہ مذہبی تفریق کو ختم کئے بغیر کسی قسم کی انفرادی یا اجتماعی ترقی ناممکن ہے۔

رات کو مولانا عبد الحق نے ایک عظیم جلسے میں اپنے حج کے تاثرات بیان کئے۔ آپ مدراس کے مشاعرے سے چند دن ہی قبل حج سے واپس آئے تھے کالج کو اوڈیٹوریم حاضرین سے بھرا ہوا تھا کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک اپنی تقریر جاری رکھ کے آپ نے ایک طلسم سا باندھ دیا۔ آپ نے حج کی مشکلات بہت وضاحت سے بیان کیں اور کہا کہ بوڑھوں بیماروں اور بچوں کے لئے یہ سفر بالکل لازمی نہیں ہے۔

سفر کی متعدد مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ ہندوستان کا سو روپے کا نوٹ وہاں ستر روپے میں فروخت ہوتا ہے حالانکہ پچھلے سال اس کی قیمت چھیانوے روپے تھی اور اس سے قبل ایک سو دس روپے۔ پاکستان کا نوٹ جو خاص طور پر حج کے لئے جاری کیا گیا ہے ایک سو بیس اور ایک سو پندرہ روپئے میں فروخت ہوتا ہے۔ آپ نے کہا کہ جس ہندوستانی حاجی کے پاس دس ہزار

روپے تھے وہ خود بخود وہاں سات ہزار میں تبدیل ہو گئے۔

دوسری صبح کو ڈاکٹر صاحب کرنول کے بعض تاریخی مقامات دکھلانے کے لئے لے گئے۔ کالج کے قریب ہی ایک گنبد ہے جس میں سلاطینِ کرنول آرام فرما رہے ہیں۔ ان قبروں میں فقط غلام رسول خاں کی قبر موجود نہیں۔ ان کے اجداد یہاں پہلو بہ پہلو سو رہے ہیں۔ غلام رسول خاں کرنول کے آخری تاجدار تھے اور راقم کے دل میں ان کا وہی مقام ہے جو حیدر علی، ٹیپو سلطان، نانا فرنویس یا جھانسی کی رانی کا ہے۔ ۱۸۳۹ء میں غلام رسول خاں نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی ایک اسکیم بنائی۔ اس اسکیم کے تحت کرنول میں ایک زمین دوز اسلحہ خانہ اور بارود خانہ قائم کیا گیا لیکن وقت سے پہلے یہ راز فاش ہو گیا۔ غلام رسول خاں گرفتار ہو گئے اور ریاست کو انگریزی عملداری میں شامل کر لیا گیا۔ اس وقت بھی اگرچہ جاں باز سپاہیوں نے جنگ شروع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن غلام رسول خاں کو چونکہ اپنی رعایا کا خونِ ناحق گوارا نہ تھا اس لئے انھوں نے یہ کہہ کر کہ اب فتح کا امکان باقی نہیں رہا، اس امر کی اجازت نہ دی۔

بعد میں غلام رسول خاں رہا ہو کر ترچنا پلی چلے گئے جہاں اپنے ہی ایک سپاہی کے ہاتھ سے قتل ہوئے وہاں اُن کی قبر آج بھی موجود ہے۔

کرنول میں ان کے پوتے الف خاں سے میری ملاقات ہوئی۔ آپ بھی بائیس برس کے نوجوان ہیں عثمانیہ کالج میں پڑھتے ہیں جنوبی ہند کے ایک ممتاز کھلاڑی ہیں اور انٹر یونیورسٹی مقابلوں میں متعدد انعامات حاصل کرکے کالج کے نام کو چار چاند لگا چکے ہیں۔

جس گنبد کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اُس کے فنِ تعمیر کا نمونہ اس اذکر میں ضروری سمجھتا ہوں گنبد تو اس قسم کے ہندوستان بھر میں اکثر موجود ہیں لیکن اس کے ساتھ ۶۰×۲۰×۸۰ کا ایک ہال موجود ہے جس کی چپٹی چھت پتھر کی سلوں سے بنائی گئی ہے اور یہ چھت بغیر کسی لوہے یا لکڑی کے سہارے کے آج تک جوں کی توں موجود ہے۔ گنبدوں کی بغیر سہارے کے گول چھتیں تو سمجھ میں آسکتی ہیں لیکن اس چھت کی تعمیر کو بڑے بڑے انجینئر بھی حیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بعض انجینئروں کا یہ خیال تھا کہ اس کے اندر لوہے کے گرڈر یا سلاخیں موجود ہوں گی لیکن مختلف آلے لگا کر وہ اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پتھر کی سلوں کی یہ چپٹی چھت بغیر کسی سہارے کے ہے اور تعمیر کا یہ فن اپنے تخلیق کرنے والوں کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔

اس عظیم الشان گنبد اور ہال کے پیٹرل وزن کو سہارا دینے کے لئے کوئی بیس گز کے فاصلے پر پتھر کی ایک مضبوط دیوار بنائی گئی ہے۔ اس دیوار کے نیچے دریائے اندراوتی بہتا ہے۔ یہ دریا آگے جا کر دریائے تنگ بھدرا میں ملتا ہے سنگم کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے افسوس کہ میں اُسے دیکھنے نہ جا سکا۔ دریا کے پار اشجار کے جھنڈ

ہیں اور جہاں یہ ختم ہوتے ہیں وہاں سے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دریا جنگل اور پہاڑ مل کر ایک عجیب منظر دکھاتے ہیں۔ میرے میزبانوں نے جس بالاخانے میں میرے قیام کا انتظام کیا تھا اس کے عین نیچے دریا بہتا تھا اور میں تینوں دن اس منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

شام کے چار بجے "کرنول میں اردو" کے موضوع پر آغا حیدر حسن لکچرر عثمانیہ یونیورسٹی کی تقریر تھی۔ آپ حیدرآباد سے تشریف نہ لا سکے۔ چنانچہ ع

قرعۂ فال بنام منِ دیوانہ زدند

اور میں نے اردو اور اس کے مستقبل کے متعلق کوئی بیس پچیس منٹ تک اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ رات کو مشاعرہ تھا۔ وہی کوآپریٹو ہال پھر کھچا کھچ بھر گیا۔ اب کے بھی صدارت مولانا عبدالحق نے کی اور اپنے صدارتی فقرات سے مشاعرے میں جان ڈال دی۔ یہ مشاعرہ بھی صبح کے ڈیڑھ بجے تک جاری رہا۔ متعدد مقامی شعراء نے شرکت کی۔ بزم اقبال کے صدر حضرت نوّاب اور سکریٹری بھی شریک ہوئے۔ بزم اقبال شہر کی ایک ادبی انجمن ہے جس کے زیرِ اہتمام وقتاً فوقتاً ادبی اجلاس اور مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی چند دن بعد ایک مشاعرہ اس بزم کے زیرِ اہتمام منعقد ہونا تھا۔ مجھے اس میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی لیکن اب مزید قیام چونکہ ناممکن تھا۔ اس لئے میں نے معذرت چاہی۔ حضرت نوّاب کا تعلق کرنول کے شاہی خاندان سے ہے اور آپ کی بدولت شہر کی علمی و ادبی روایات ابھی تک بدستور چلی آتی ہیں۔

یہ مشاعرہ جیسے بار مجبوری صبح کے ڈیڑھ بجے ختم کر دیا گیا ابھی اور بھی طول کھینچتا اگر یہ بھی خیال امر کا احساس نہ ہوتا کہ قریباً سو سوا سو طلبہ پر مشتمل ایک جماعت کو صبح چار بجے کی گاڑی سے اپنے کمانڈر دیکھنے کے لئے روانہ ہونا ہے اور ان میں اکثر مشاعرے میں حصہ لینے والے طلبہ و مشاعرے کے منتظمین تھے۔

کوئی دو بجے کے قریب فارغ ہو کر میں اپنے کمرے میں آیا اور اس رپورٹ کو جس کی ابتدا کرنول ہی میں ہو گئی تھی مکمل کرنا شروع کر دیا۔ جب طلبہ صبح چار بجے اسٹیشن کو روانہ ہونے لگے تو میں سو گیا اور ساڑھے سات بجے تک سوتا رہا۔ آج ایک بجے کی گاڑی سے دہلی روانہ ہونا تھا۔ دن بھر کوئی کام نہ تھا بالکل فارغ رہا۔ کچھ وقت رپورٹ کی تکمیل میں صرف کیا۔ پھر زیدی صاحب آ گئے۔ اُن سے باتیں ہوتی رہیں۔ ساڑھے بارہ کے قریب ہم سب اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالحق کو واپس مدراس جانا تھا۔ اُن کی گاڑی کا وقت ایک گھنٹہ بعد تھا لیکن میری گاڑی کچھ دیر سے آئی۔ لہٰذا دونوں قریباً ساتھ ہی ساتھ اسٹیشن پہنچیں۔ یہاں ڈاکٹر صاحب اور دوسرے احباب کو جنھوں نے اسٹیشن پر آنے کی زحمت دی تھی بادلِ ناخواستہ الوداع کہی اور میں یہ محسوس کرتا ہوا کرنول سے روانہ ہوا کہ ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں

۱۵؍نومبر ۱۹۵۰ء

۹۱۵۶۴۸ ۳۴۹

(۵۴۰)

۳۳۰۹۱

Date	No.	Date	No.